8
فروری
Biswin
Sadi
افسانے
داستانیں
یسویں صدی
لاہو
شاہکار
دلفریب مضامین
علم وادب
صحت وسائنس
حسن وعشق

فروری ۱۹۴۷ء

قیمت فی پرچہ ۸ ؍

جلد ۲۳

نمبر ۲

سالانہ چندہ

خاص نمبر سمیت

پانچ روپے

ششماہی چندہ

تین روپے

ایڈیٹر

خوشتر گرامی

ٹیلیفون نمبر ۴۱۵۴

مینجر رسالہ "بیسویں صدی" بیرون شاہ عالمی دروازہ لاہور

آپ نے کہا ہم نے سنا

از
ایڈیٹر

"نہرو گورنمنٹ نے سفارش کی تھی کہ ہندوستانیوں کو خطابات دینے کا سلسلہ ختم کر دیا جائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لارڈ ویول نے یہ سفارش مان لی اور خطابات کی بنی بنائی فہرست دھری کی دھری رہ گئی۔ اب لوگوں کے دل کی کیا کیفیت ہوگی جو خطابات حاصل کرنے کیلئے اپنے معنوی باپ یعنی انگریز کی خوشامدیں کیا کرتے تھے؟"

(اندر جیت مہتہ۔ راولپنڈی)

وہی کیفیت جو باپ کے مرنے پر ہوتی ہے۔

"ایک اشتہار نظر سے گزرا یہ اشتہار "ور کیلئے کنیا کی ضرورت" کا تھا۔ اس میں لکھا تھا کہ ایک کھشتری نوجوان کیلئے جس کی عمر ۲۸ سال ہے اور قد ۵ فٹ ۸ انچ ہے ایک ایسی خوبصورت دلہن کی ضرورت ہے جس کا قد بھی لمبا ہو۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ اشتہار دینے والے کو خاص طور پر قد کی کیوں فکر ہے؟"

(رومیش چندر بھاٹیہ۔ تونسہ)

اس لئے کہ آزاد ہند میں عورتوں کی فوج بھی بھرتی کی جائے گی۔

"ملک فیروز خاں نون نے ایک ہفتے تک مغربی پنجاب کا دورہ کرنے کے بعد ایک بیان دیا ہے جس میں آپ نے کہا ہے "میں نے یہ دورہ اس لئے کیا ہے کہ مسلمانوں کو تجارت کا شوق دلایا جائے۔ لیکن افسوس ہے کہ ان دیہات میں مسلمان چنے اور باجرہ کھا کر گزران کر رہے ہیں۔ کیا ملک صاحب کو ان دیہاتیوں سے واقعی ہمدردی ہے؟"

(دینا ناتھ سبھال سرہند)

ہمدردی سچی ہو یا جھوٹی جب لیڈر لوگوں کو پلاؤ زردہ میسر ہے تو خالی خولی ہمدردی کا اظہار کر دینے میں کیا حرج ہے؟

"انتظار کرتے کرتے آنکھیں پُرخار ہو گئیں دل کا قرار جاتا رہا لیکن بارہا دل میں خیال گزرا کہ آپ کو صرف یہ لکھ کر جوابی خط بھیجوں ؎

بلبل تو نالۂ نہ کشیدی چہ شد ترا

لیکن ایک لمحہ بعد بدل گیا۔ شاید آپ مجھے اور میری ناچیز پیشکش کو بھول ہی گئے ہوں۔ میں نے آپ کی خدمت میں ایک کہانی "بنام پھول وتی" بھیجی تھی۔ لیکن آپ نے مجھے جواب نہ دیکر شش و پنج میں ڈال رکھا ہے۔ اب کے پھر عرض کرتا ہوں۔ کہ میری دل شکنی نہ کیجئے۔ پھر دیکھیں گے کہ آئندہ میرا قلم کن کن نقطوں کی خبر لاتا ہے"۔

(اندرجیت سنگھ امرتسر)

آپ انتظار تو کرتے رہے۔ لیکن معلوم نہیں انتظار کے عالم میں اپنی آنکھوں کو کس وادیٔ پُرخار میں گھسیٹتے پھرے۔ کہ آنکھیں پُرخار ہو گئیں دیکھئے۔ اندرجیت سنگھ جی! سوال دل شکنی کا نہیں بلکہ ادبی معیار کا ہے۔ چونکہ آپ کی کہانی میں "بنام پھول وتی" جیسے بھاری بھرکم شاہکار اس قدر زیادہ تھے۔ کہ "بیسویں صدی" اس بوجھ کا متحمل نہ ہو سکتا تھا۔ اس لئے یہ کہانی شائع نہ ہو سکی۔ آپ اپنے قلم سے "سرورست" نقطوں" کی خبر لائیے۔ افسانہ نویسی کی خبر نہ لیجئے۔

"آل انڈیا اسٹوڈنٹس کانگرس کے اجلاس کا سب سے زیادہ دلچسپ پہلو یہ تھا۔ کہ اس میں یو۔پی، پنجاب اور سرحد کے طلبہ نے دو سو نئی نظمیں پڑھیں۔ جو ان کی اپنی اپنی تیار کی ہوئی تھیں۔ کیا طلبہ کا کمال نہیں؟"

(ارشاد حسین۔ دہلی)

نہیں۔ "یہ شاعرگر" حضرات کا کمال ہے۔

"آپ کا سالنامہ نظر سے گزرا..... صاحب کی تصویر دیکھی یہ بلاک کیمرہ کی تصویر سے نہیں بلکہ آرٹسٹ کی بنائی ہوئی تصویر سے بنایا گیا ہے۔ بہرحال خوب ہے!"

(دت بھارتی۔ دہلی)

اللہ رے بدگمانی! اجی دت صاحب! ہمارے پاس..... صاحب کا کیمرہ فوٹو موجود ہے۔ اور یہ صاحب بھی زندہ و سلامت موجود ہیں۔ لیکن ہمارے پاس نہیں بلکہ آپکے ذہن میں +

نازو نیاز

از
ایڈیٹر

ایک عنوان ہے :-
دو انگریز آئی۔سی۔ایس ملازمت ترک کر رہے ہیں۔
لیکن دو انگریزوں کے جانے سے "جہاں پاک" نہیں ہوتا۔

سُرخی ہے :-
ایک ترکھان کی چوری۔ چور پکڑے گئے۔
کیا ترکھان برآمد ہوا یا نہیں ؟

ایک اخبار کے لیڈنگ آرٹیکل کی سُرخی :-
لارڈ ویول کا خاص آدمی کون ہے ؟
ان کا خانساماں !

عنوان ہے :-
سیاہ رنگ ہونے کے باعث لڑکی چھوڑ دی۔
پوڈر کے عہد میں یہ ظلم ؟

عنوان ہے -
ریاست ٹیڑھی میں سخت گیری۔
سیدھی کر لے !

ایک خبر کا عنوان ہے :-
آئی۔سی۔ایس افسروں کو آٹھ ہزار پاؤنڈ معاوضہ دیا گیا۔
ہاتھی جیتے کا ایک لاکھ مرے کا سوا لاکھ

لالہ دیوراج سیٹھی ایم۔ایل۔اے ممبر بجلی کنٹرول بورڈ نے ایک بیان میں کہا ہے
کہ پنجاب میں تین سال تک بجلی کا قحط رہیگا۔
یا اللہ ! مینہ برسا !

عنوان ہے :-
حکومت سندھ سے وعدہ پورا کرانے کے لئے خاکسار دھڑا دھڑ لاہور پہنچ رہے ہیں۔
تو گویا بندرگاہ لاہور پر اتریں گے۔

خبر کا عنوان ہے :-
گاندھی جی گاؤں گاؤں کے دورہ پر۔
ہاتھی پھرے گاؤں گاؤں جس کا ہاتھی اُس کا ناؤں۔

خبر ہے۔ کہ لدھیانہ میں کھانڈ سے لدے ہوئے پندرہ سو گدھے گرفتار کئے گئے۔
سزا یابی پر وہ "بی" کلاس کا مطالبہ کرینگے۔

خبر کا عنوان ہے :-
ایک مولوی حوالۂ پولیس۔
نمازی قیدیوں کے لئے مژدہ !

عنوان ہے :-
تمباکو کا حساب رکھنا ممکن نہیں۔
پنڈت میلارام وفا اور مولانا ظفر علی خاں کا بھی یہی فتویٰ ہے۔

سالنامہ بیسویں صدی

شاعرِ شباب حضرت مجید لاہوری

لیجئے میری زندگی کی حسین ترین راتوں میں آج کی رات بھی شامل ہو گئی ——

رات بھر جاگا ہوں "بیسویں صدی" کا سالنامہ پڑھنے کے لئے! کہانیاں، نظمیں، غزلیں، مضامین.. سبھی کچھ اس قدر دلچسپ ہے کہ بس پڑھتے ہی چلے جائیے کہیں بھی تو طبیعت نہیں اکتاتی آپکے حسن انتخاب نے کتنی دلچسپیوں کو یکجا کر دیا ہے یقین کیجئے کہ آپ کا سالنامہ "عظیم الشان کارنامہ" ہے.....

ادیب الملک حضرت اختر شیرانی

سالنامہ ہر لحاظ سے بہت خوب ہے

جناب پنڈت ہری چند اختر ایم۔ اے

سالنامہ آنکھوں نے اور دل نے پسند کیا.....

جناب حاجی لق لق مدیر روزنامہ "زمیندار" لاہور

اگرچہ نظروں سے گزرے ہیں سالنامے بہت
مگر وہ بات کہاں "بیسویں صدی" کی سی

حاجی لق لق

حضرت علامہ ابو نعیم نشتر جالندھری

......مطالعہ جو شروع کیا تو میں ایسی فردوس روح دنیا میں کھو گیا کہ رسالہ ختم ہو گیا لیکن قلب و نظر دیر تک کیف و سرور کے زمزم و کوثر میں تیرتے رہے۔

جناب خان اصغر حسین خان نظیر لدھیانوی

سالنامے کی دلفریب ترتیب کی داد دوں۔ کہ ادبا و شعراء کی تصاویر اور سرورق کے حسن کی تعریف کروں۔ سالنامہ بلند پایہ افسانوں، مزاحیہ مضامین رومانی نظموں اور دلکش غزلوں کا ایک البم ہے شعرا و ادبا کے خود نوشت سوانح حیات سے سالنامہ صحیح معنوں میں "محفل ادب" بن رہا ہے۔ آپ نے اس سالنامے کی اشاعت سے ادب اردو میں یقیناً بیش بہا اضافہ کیا ہے۔

مجھے توقع ہے کہ اہل نظر اسے مدتوں محفوظ رکھیں گے۔ اور ایک عرصہ تک اس سالنامے کے گلہائے رنگا رنگ سے دل و دماغ کو معطر کرتے رہیں گے....

جناب محمود یار خاں آثر ایم۔ اے

زیرِ نظر سالنامہ اپنے تمام گذشتہ نمبروں سے واقعی نمبر لے گیا ہے مضامین کی ترتیب و تدوین فن ادارت کی نمایاں کامیابی کی بیّن مثال ہے۔

یہ سالنامہ ایک سبدِ گلچیں ہے۔ جس میں گلہائے رنگا رنگ زیب دے رہے ہیں۔ نثر کا ہر لفظ دُرِ منثور کی طرح صفحۂ قرطاس پر پھیلا ہوا ہے اور نظم کا ہر شعر عقدِ ثریا کی ہر لڑی سے بازی لے گیا ہے۔ افسانے اور منظومات اس قدر روح پرور اور فرحت زا ہیں کہ احاطۂ تحریر میں نہیں آ سکتے.....

جناب آثر چکوالی بی۔ اے

سالنامہ "بیسویں صدی" دلچسپ افسانوں اور بلند پایہ نظموں کا بہترین مرقع ہے۔ ادبی دنیا میں یہ سالنامہ بے نظیر ہے.....

جناب محمد امین نشتر فتحپوری مدیر "شمع" دہلی

سالنامہ بہت خوب ہے۔ آپ کے تبرد نشتر جو اس مرتبہ تصورات بن گئے ہیں اچھے ہیں خوب لطف اندوز ہوا۔ آپ کی محنت قابل تحسین ہے

جناب بشیر ملاٹھوی۔

حیران ہوں کہ سالنامہ کی تعریف کروں یا آپ کے حسن انتخاب اور ذوق سلیم کی داد دوں۔ کیف پرور غزلیں، دلگداز اور دلفریب افسانے، ادب پارے۔ غرض علم و ادب کا ایک ایسا نادر مجموعہ، ایک ایسا انمول خزانہ جو دوسروں کے لئے مشعلِ راہ اور "بیسویں صدی" کے ہزاروں لاکھوں پریمیوں کی جانِ تمنّا ہے۔ بقول شاعر

زیب دیتا ہے اسے جس قدر اچھا کہئے

جناب رام لال

سالنامہ اس کا سرورق اور مضامین اور مضامین کی ترتیب اور

انتخاب دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی ....

جناب وصدیقی فیض آبادی۔

ماشاءاللہ آپ کے حسن نظر نے کیف و سرور کے دریا بہا دیئے ہیں غزلوں افسانوں اور ادب پاروں کے انتخاب کو دیکھتے ہوئے کہنا پڑتا ہے۔ کہ آپ کا ادبی ذوق کس قدر وسیع ہے۔ اور بیسویں صدی کا یہ سالنامہ ادبی رسالوں میں امتیازی جگہ حاصل کریگا.....

محترمہ پروفیسر مس کرشنا کماری ایم اے۔

کاغذ کی موجودہ گرانی میں اتنا بلند پایہ اور شاندار نمبر نکالنا یقیناً بیسویں صدی کا معجزہ ہے.....

روزنامہ "زمیندار" لاہور

رسالہ "بیسویں صدی" جس طرح تمام رسائل سے ممتاز و نمایاں حیثیت رکھتا ہے اسی طرح اس کا سالنامہ بھی امسال خاص امتیاز کا حامل ہے۔ بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا۔ کہ "بیسویں صدی" کے اس سالنامے نے اپنے گذشتہ سالناموں کا ریکارڈ مات کر دیا ہے۔ یہ نادر صحیفہ سوا دو سو صفحات پر پھیلا ہوا ہے جن پر ساٹھ سے زیادہ مقتدر و نامور اہل قلم نے قلم کے جوہر دکھائے ہیں نظمیں بلند پایہ۔ مضامین دلپسند۔ افسانے اچھوتے اور مزاحیہ مضامین طرب انگیز ہیں.....

روزانہ "زمزم" لاہور

یہ سالنامہ نہ صرف بیسویں صدی کے گزشتہ سالناموں پر ہی سبقت لے گیا ہے۔ بلکہ امسال دوسرے ماہناموں کا کوئی سالنامہ بھی ظاہری و معنوی خوبیوں کے اعتبار سے بیسویں صدی کے سالنامے کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اشتہارات کا حصہ بہت کم ہے۔

اس مختصر سی صحبت میں ہم اس سالنامے کے تمام محاسن پر روشنی ڈالنے سے معذور ہیں۔ لیکن جناب خوشتر گرامی کی محنت اور کاوش کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ آپ نے یہ سالنامہ شائع کر کے ادب اردو میں یقیناً گیش بہا اضافہ کیا ہے۔ ہمیں امید ہے۔ کہ شائقین علم و ادب اس سالنامے کو مدتوں محفوظ رکھیں گے۔

روزانہ "جے ہند" لاہور

"بیسویں صدی" کا شمار شمالی ہند کے اُن کامیاب اور بہترین ماہناموں میں ہے۔ جنہوں نے عوام کے ذوق کو مدنظر رکھنے کے علاوہ اپنا ادبی معیار بھی بلند رکھا ہوا ہے۔ "بیسویں صدی" کا یہ سالنامہ اس کا روشن ثبوت ہے اس میں چوٹی کے افسانہ نگاروں۔ ادیبوں اور شعرا کے شاہکار درج ہیں۔ لاہور کے بہت سے ماہنامے اپنے سالانہ نمبر شائع کرتے ہیں۔ مگر "بیسویں صدی" کے اس سالنامے کا شاید ہی کوئی دوسرا ماہانہ مقابلہ کر سکے......

روزانہ "ملاپ" لاہور

لاہور کے بلند پایہ ادبی ماہنامہ "بیسویں صدی" کے سالنامہ میں ملک کے چوٹی کے ادیبوں اور شاعروں کے ۸۰ شاہکار درج ہیں۔ غرضیکہ سالنامہ ظاہری و باطنی محاسن سے مالا مال ادبی مرقع ہے....

سالنامہ بیسویں صدی ختم ہو گیا۔ ایجنٹ حضرات آرڈر نہ بھیجیں

سالنامہ "بیسویں صدی" ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں اتنا زیادہ مقبول ہوا کہ ایجنٹ حضرات تاروں اور جوابی کارڈوں کے ذریعہ دوبارہ سہ بارہ فرمائشیں بھیج رہے ہیں۔ لیکن ہم اُن کی تعمیل سے قاصر ہیں۔ چونکہ سالنامہ ختم ہو چکا ہے۔ اس لئے ایجنٹ حضرات سے درخواست ہے کہ وہ سالنامہ کے لئے مزید آرڈر نہ بھیجیں۔

مینجر رسالہ "بیسویں صدی" بیرون شاہ عالمی دروازہ۔ لاہور

افسانہ

از

جناب بھیم شنکر پروانہ بی۔ اے

لیٹے لیٹے اخبار بینی میں مشغول تھا۔ نواکھالی، بہار، گڈھ مکتیسر کے دردانگیز واقعات پیش نظر تھے، کیا انسان اس قدر پتھر دل ہو سکتا ہے؟ جو واقعات آنکھوں کے سامنے آ رہے تھے۔ اُن پر یقین نہ ہو رہا تھا، ہندو جو ایک گھایل چوہے کو بھی مرتا نہیں دیکھ سکتا، جو سانپوں کو بھی دودھ پلاتا ہے کیا ہو گیا اُسے، اور یہ مسلمان ——— کیوں آگ لگائی نواکھالی میں اُنہوں نے؟ کیوں یہ اسلام کے نام کو بدنام کر رہے ہیں، بے گناہوں، یتیموں اور لاوارثوں کے خون سے ہاتھ رنگنے سے تو کسی کا ایمان سلامت نہیں رہتا پھر یہ کیسے مسلمان ہیں ——— کیسے ایمان والے ہیں۔ بنگال کے مٹھی بھر مسلمانوں نے سارے ہندوستان کے مسلمانوں کو بدنام کر دیا۔ ان مٹھی بھر ہندو مسلمانوں نے ایک آگ لگائی جس کے شعلوں کو بجھانا نہرو، آزاد اور جناح کے لئے بھی مشکل ہو رہا ہے۔ مہاتما گاندھی کی آواز بھی اس نقار خانے میں سنائی نہیں دیتی۔

شریمتی جی اُدھر دوسری کھاٹ پر پڑی پڑی انگڑائی لے رہی تھیں بیچ میں میز پر لیمپ جل رہا تھا۔ اس کی روشنی میں صاف نظر آ رہا تھا کہ اُنہیں نیند نہیں آ رہی کیوں نہیں آ رہی ہے یہ کون جانے۔ مجھے نواکھالی پٹنہ اور بہار کے واقعات مضطرب کئے ہوئے تھے۔ اس اضطراب کے عالم میں بھی سگرٹ کا دھواں برابر میرے منہ سے نکل رہا تھا۔ کیونکہ دن بھر کی تھکاوٹ کے بعد یہی اخبار اور سگرٹ میری تفریح کا سامان ہے۔ شریمتی جی کی تفریح کا سامان کچھ اور ہی تھا۔ کیونکہ اخبار سے اُنہیں رغبت نہ تھی، اور سگرٹ پینے کے درجے تک وہ اپ ٹو ڈیٹ نہ تھیں۔ آخر اُن کے منہ سے نکل ہی گیا۔

"کیا سوچ رہے ہو؟"

"کچھ نہیں"۔

"کچھ تو"

"کچھ بھی نہیں"۔

"میں جان گئی"۔

"کیا؟"

"بتا دوں؟"

"ہاں ہاں"۔

"مگر......"

"مگر کیا؟"

"تم مجھے چھیڑو گے؟"

"خواہ مخواہ"۔

"جی میں آپ کو خوب سمجھتی ہوں"۔

"کیا سمجھتی ہو؟"

یہی کہ جب آپ سگرٹ کے لمبے لمبے کش لگا کر میری طرف گھور گھور کر دیکھتے ہیں، تو میں سمجھ جاتی ہوں کہ اب آپ مجھے ...."

"چھیڑیں گے"۔ یہی کہنا چاہتی ہو نا"

"دیکھئے آپ نے وہی حرکت کرنا شروع کر دی، میں تمہیں جانتی ہوں نا..."

"خوب میں چھیڑ رہا ہوں تمہیں۔ ارے تم تو خود میرے سر چڑھی جا رہی ہو"۔

"واہ بھئی واہ میں تمہارے سر چڑھوں گی۔ میں ایسی کب تھی تمہیں اگر میرا پاس رہنا بھی برا معلوم ہوتا ہے تو لو میں چلی ......"

ارے نہیں سنو تو ...... تمہیں میری قسم ...... سچ سچ جب تم غصہ کرتی ہو تو لال پری معلوم ہوتی ہو اور دیکھو تو غصے میں ہنسی نہیں آیا کرتی، یہ تمہارا کیسا غصہ ہے۔ جو ہنسی ہونٹوں سے پھوٹی پڑتی ہے یہ تو بھانڈا پھوڑے دے رہی ہے۔ اور سنو ......"

"بس ...... بس ...... بس"

"سنو تو"

"ہاں...... ہاں...... ہاں...... تم سچ مچ بڑے وہ ہو........"

"میں کہتی تھی نا"........."تم مجھے چھیڑو گے"۔

شریمتی جی کی پرانی عادت ہے کہ وہ مجھے خالی بیٹھے دیکھ کر چھیڑ دیا کرتی ہیں، اور ساتھ ہی اُس چھیڑ خانی کی تہمت بھی میرے سر رکھ دیتی ہیں، میرے اور اُن کے درمیان وہاں کوئی اور تو ہوتا نہیں۔ جو اس بات کا فیصلہ کرے کہ دراصل مجرم کون ہے۔ اُنہیں گرم دیکھ کر میں خود اقبالی مجرم بن جاتا ہوں اور پھر اُن کی عدالت میں جو کچھ بھی سزا ملتی ہے، سر جھکا کر قبول کر لیتا ہوں۔ یہی آج بھی ہوا۔ کہاں تو نواکھالی، بہار اور پٹنہ کے واقعات سے گھایل ہو رہا تھا۔ کہاں شریمتی جی کی باتوں کے جھانسے میں آکر سب کچھ بھول بیٹھا۔ اب میں تھا اور وہ تھیں۔ وہ تھیں اور اُن کی بھولی بھالی باتیں۔ آہستہ آہستہ لیمپ کی روشنی بھی مدھم ہوتی چلی گئی! اور اُس کے ساتھ ساتھ میرے جیون ناٹک کا وہ سین بھی ختم ہوتا چلا گیا۔ اُن کی آنکھیں بند ہوتی جا رہی تھیں، نیند اُنہیں اپنی آغوش میں تھپکیاں دے دے کر سلائے دے رہی تھی۔ مگر آہ میری آنکھوں میں نیند کہاں تھی! مجھے یاد آرہا تھا آج سے پندرہ سال پہلے کا ایک واقعہ ایک درد بھری رنگین داستان، اپنی جوانی کی ایک بھولی ہوئی یاد...... جسے آج شریمتی جی نے تازہ کر دیا تھا۔ میرے کلیجہ پر ایک چھری چل گئی تھی۔ میں تڑپ اُٹھا تھا، میں کروٹیں لے رہا تھا معلوم نہیں کیوں میرے کلیجے کا لہو آنکھوں کے راستے نکلنے سے رُکا ہوا تھا۔

آج سے پندرہ سال پہلے بھی کسی نے مجھ سے کہا تھا......"تم مجھے چھیڑو گے؟"

اور یہ وہ زمانہ تھا جب میں یہ بھی بخوبی نہ سمجھتا تھا کہ جب کوئی دوشیزہ ایسے سحر آگیں الفاظ منہ سے کہتی ہے تو اس کا مطلب کیا ہوتا ہے۔

میرے اور بملا کے مکان کے درمیان محض ایک اینٹ کی دیوار تھی۔ اُس ایک اینٹ کی دیوار میں بھی ہم نے ایک ایک اینٹ نکال کر جھروکے بنا لئے تھے۔ جس سے ہم دونوں تاک جھانک کر لیا کرتے تھے۔ یہ اُس زمانہ کی بات ہے جب میں ادھر اپنی والدہ کی آغوش میں لیٹا ہوتا، اور اُدھر بملا اپنی والدہ کی گود میں دودھ پیتی ہوتی۔ ہماری باتیں کچھ اس قسم کی ہوتیں:-

"بملا!"

"ہوں!"

"کیا کر رہی ہو؟"

"لیٹی ہوں!"

"کس کے پاس لیٹی ہو؟"

"ماں کے پاس لیٹی ہوں"۔

"اور ماں کیا کر رہی ہیں؟"

"ماں پتا کے پاس......" "چپ......"

بملا کی ماں اُس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیتی اور ادھر میرے ماتا پتا قہقہہ لگا کر ہنس پڑتے۔ نہ جانے کیوں بملا کو پیٹا جاتا اور اُس کے آہستہ آہستہ رونے کی آواز میرے کانوں میں گونج اُٹھتی۔ بات میں نے پوچھی تھی، ماری بیچاری بملا گئی، جانے کیوں میری سمجھ میں کچھ نہ آتا؟ میرا ننھا سا دل نہ جانے کیوں رو اُٹھتا۔

دوسرے دن بملا سے ملاقات ہوتی۔ میں دریافت کرتا۔

"ماں کیا کر رہی تھیں کل بملا!"

بملا کہتی۔

"ماں پتا کے پاس...... مگر نہیں ماں نے کہا ہے۔ ایسی بات کسی سے نہیں کہی جاتی"۔

"میں کہتا! اُونہوں جانے بھی دو مگر تمہیں پیٹا کیوں تھا؟"

بملا خفا ہو کر کہتی۔

"پیٹا تھا پھر۔ میں اُن کی بیٹی جو ہوں، ماں کہتی تھیں۔ بیٹی کو پیار بھی کیا جاتا ہے اور پیٹا بھی جاتا ہے"۔

"مگر میری خاطر کیوں پیٹا تھا؟ بات تو میں نے پوچھی تھی"۔

کیا میں اتنی بات بھی نہیں پوچھ سکتا؟ کیا میں تمہارا کوئی نہیں؟"

"کوئی کیوں نہیں۔ تم میرے سب کچھ ہو۔ میں اور کسی کے ساتھ تو کھیلتی بھی نہیں!"

اور بملا میرا ہاتھ پکڑ کر ناچنے لگتی

تاتھئی ...... تاتھئی .... تاتھئی

ایک دن ہم دونوں ایک کھیل کھیلے ——— ماں باپ والا کھیل۔

بملا ماں بنی، ایک پلے کی ماں جسے وہ نہ جانے کہاں سے اُٹھا لائی تھی اور مجھے بننا پڑا باپ ——— اُس پلے کا باپ! جس کی ماں بملا بنی تھی۔ پلہ "کیں کیں" کر کے رو دیا اور بملا اپنے "منواں" کو سلانے بیٹھی لوریاں دے دے کر، تھپکیاں دے دے کر ٹھیک جیسے اُس کی ماں اُس کے چھوٹے بھائی کو سُلایا کرتی تھی۔

ڈراما پہلے سے تیار کر لیا گیا تھا، وہ اپنا پارٹ ادا کر رہی تھی۔ مجھے اپنا پارٹ ادا کرنا تھا۔ میں نے کہا ———

"بملا"

"چھی۔ تم میرا نام لیتے ہو"۔

اُس نے کہا۔

"پھر کیا کہوں تمہیں رانی!"

"میں کیا جانوں ...... " اُس نے ناز سے منہ پھیر لیا۔

"ایک بات سنو رانی"۔

"نہیں سنتی جاؤ"

اُس نے دوسری طرف منہ پھیر لیا، جیسے مداری کی بندریا بندر کے منانے پر منہ اِدھر سے اُدھر پھیر لیتی ہے۔

"دیکھ تیرے لئے مٹھائی لایا ہوں"۔

"نہیں کھاتی مٹھائی"۔

"حلوا سوہن، قلاقند، بنگالی مٹھائی"۔

"نہیں چاہئے۔ مجھے یہ سب کچھ"۔

"بات کیا ہے میری رانی؟"

"نہیں بتاتی"۔

"بتا دو اچھا ایک پیسہ لے لو"۔

"آں ہاں ..... اوں ہوں ...."

"دو لے لو"۔

"نہ .... نہ ...."

"پھر کیا لو گی؟"

"کچھ نہیں"۔

اب مجھے طیش آتا۔ میں بملا کی چوٹی پکڑ کر کھینچتا، وہ چیختی ———

"ہاں۔ ہاں۔ بچہ جاگ اُٹھے گا"۔

میں کہتا۔ جاگ اُٹھنے دو ——— خیریت چاہتی ہو تو یہ رس گلّا کھا لو پہلے"۔

اور بملا پلے کو چھوڑ کر اُٹھتی۔ میرے ہاتھ سے جھوٹ موٹ رس گلّا کھاتی اور پھر آنکھوں میں مسکراہٹ بھر کر کہتی۔

"میں جانتی تھی آتے ہی ——— تم مجھے چھیڑو گے"۔

پھر اُس چھیڑ چھاڑ کے بعد بملا روٹی پکاتی، دفتر سے تھکا ماندہ آ کر میں روٹی کھاتا۔

اور بچہ ——— وہی پلا "کیں کیں" کرتا ہوا ایک طرف بھاگ جاتا۔ ہم دونوں کے کھیل میں اب اُس کی ضرورت نہ رہتی۔

آہستہ آہستہ بچپن گزرا۔ اب وہ زمانہ آیا۔ جب لڑکپن عالم شباب کی اونچی نیچی لہروں سے ٹکرانے لگا۔ گنگا جمنا کے سنگم میں بھنور اُٹھنے لگے، من کی موجیں ہلورے لینے لگیں، نہ جانے کیوں بملا مجھ سے دور دور رہنے لگی۔ اور مجھے اُسے دیکھے بغیر چین نہ پڑتا۔ ایک دن میں نے اُسے گھیر کر پوچھا۔

"بملا تم مجھ سے دُور دُور کیوں رہتی ہو؟"

"کیا مطلب" اُس نے کہا ———

"تم مجھ سے بھاگتی کیوں ہو؟"

"کہاں بھاگتی ہوں .... تمہارے پاس تو بیٹھی ہوں"۔

اُس نے مسکرا کر کہا۔

"نہیں کوئی بات ضرور ہے۔ تم نے محبت کم کر دی"

"محبت" .... اُس کا گلا بھر آیا۔

اُس کی آنکھوں سے دو بوند آنسو ٹپک پڑے۔ میں نے اُس کی ٹھوڑی ہاتھ سے اُٹھائی اور کہا ———

"بملا تم روتی ہو! بات کیا ہے؟"

"کچھ نہیں" اُس نے کہا۔

"کچھ تو!"

میں نے بضد ہو کر دریافت کیا۔

"اتنا بھی نہیں سمجھتے، ماں نے تم سے ملنے کو منع کر دیا ہے"۔

اُس نے اپنے دل کا حال کہہ دیا۔

"کہتی ہیں، جوان لڑکی کسی سے نہیں ملتی جلتی۔ اُن کا خیال ہے...."

"کیا؟"

"یہی کہ شاید موقع پاکر.... تم.... مجھے..........

چھیڑ دو گے"........ کہتے کہتے بملا کی زبان رک گئی۔ میرے بھی دل میں تیر سا لگا۔

بملا کے ماں باپ کا میری طرف سے ایسا خیال!

"مجھے کوئی آوارہ غنڈہ سمجھ رکھا ہے" میں نے کہا۔

"........ مگر بملا تم بھی کیا مجھے کوئی بدمعاش سمجھتی ہو؟ جو تمہیں اکیلا پاکر......"

اُس نے سمجھ لیا کہ اُس کی بات نے میرے کلیجے پر نشتر کا کام کیا ہے۔

بڑی سمجھدار تھی، بملا!

بات ٹالنے کے لئے وہ مسکرائی۔

مسکرا کر اُس نے اپنا ہاتھ میرے منہ پر رکھ دیا۔

کہا ——————

"دھت! میں تمہیں بدمعاش سمجھوں گی، ایسا سمجھتی تو میں تم سے ملنے کیوں آتی"۔

اُس کے بعد بڑی دیر تک باتیں ہوتی رہیں، چلتے چلتے اُس نے کہا۔

"ماں سمجھتی ہیں۔ تم مجھے چھیڑ دو گے اور تمہیں چھیڑنا آتا تک نہیں۔

........" اور

وہ اُٹھ کر یکدم بھاگ گئی، اور میں سوچتا ہی رہ گیا۔

یہ بملا کہہ کیا گئی۔ کیا مطلب ہے، اُس کی باتوں کا۔ یہ معمّا کیا ہے، جادوگرنی اپنا جادو کر کے چل دی، چلتے چلتے ایک منتر پھونک گئی۔ میرے دل میں ہل چل مچ گئی، میں سوچتا رہ گیا کیا معنی ہیں اس کے ——————

ماں کہتی ہیں "تم مجھے چھیڑ دو گے" اور........ مجھے چھیڑنا آتا تک نہیں"۔

سچ مچ عورت ایک راز ہے اُسے سمجھنا آسان نہیں۔ وہ مجھے الجھن میں ڈال کر بھاگ گئی، اور میں اس گتھی کو سلجھاتا ہی رہ گیا۔

یہ کہانی پرانی ہو گئی، ستیاگرہ کے زمانے میں مجھے جیل جانا پڑا۔ دو سال کی سخت سزا کاٹنے کے بعد رہا ہونے پر معلوم ہؤا۔ کہ بملا کی شادی کسی دفتر کے بابو سے ہو گئی۔ بابو صاحب کی دو بیویاں مر چکی ہیں۔ چار بچے اُن کی یادگار کھیل رہے ہیں۔ اچھی خاصی تنخواہ ہے، کھانے پینے کو بہت ہے۔ معمولی زمینداری بھی ہے۔ بس پھر اور کیا چاہئے۔ بملا کے لئے! سُن کر کلیجے پر چھُری چل گئی۔ بملا جاتے ہی، جاتے چار بچوں کی ماں بن گئی۔ یاد آ گیا لڑکپن کا کھیل۔ کیا بملا کو اسی لئے بچپن سے ماں بننے کا اتنا شوق تھا؟ آج وہ کھیل بڑا بے درد معلوم ہؤا۔ بملا نے کیوں ایک پلے کو اپنا بچہ بنا کر پیار کیا تھا۔ اُس نے دوسرے کا بچہ اپنا سمجھا تھا۔ ایشور نے اُسے عمر بھر کے لئے دوسرے کے بچوں کی ماں بنا دیا۔

پتا زمیندار تھے، سرکار کے خاص لوگوں میں سے جن کے سہارے یہ بدیشی سرکار ٹکی ہوئی تھی، میں نالائق نکلا! میرا دماغ خراب ہو گیا۔ مجھے قید کاٹنی پڑی، دو سال تک کسی نے خبر بھی نہ لی۔ کہ میں کہاں سڑ رہا ہوں۔ پھر اب چھوٹ کر گھر کیا جاتا۔ اُدھر بملا کا سہارا بھی جاتا رہا۔ سیدھے جیل سے ایک ستیاگرہی دوست کے گھر پہنچا۔ اُن کا ایک اخبار نکالنے کا خیال تھا۔ میری پہلے ہی سے آرزو تھی کہ کسی اخبار کا اڈیٹر بنوں۔ اب موقع ہاتھ آیا۔ دوست کی مہربانی سے اُسی پریس میں معاون مدیر کی حیثیت سے کام کرنے لگا۔

کئی سال گزر گئے اور گزر گئیں پُرانی باتیں۔ زمانے نے پلٹا کھایا۔ بدیشی حکومت کی بنیاد ہل گئی، جو کل تک جیل میں تھے۔ آج اُن کے ہاتھ میں حکومت کی باگ ڈور آ گئی۔ میں اپنے اصولوں میں بہت کٹر سمجھا جاتا تھا، میرے ہاتھ میں اینٹی کرپشن ڈیپارٹمنٹ دیا گیا، ذمہ داری بہت بے ڈھب تھی، مگر میں نے بھی طے کر لیا کہ کچھ بھی ہو، جو میرے ہتھے چڑھ جائے گا۔ اُسے چھوڑوں گا نہیں۔ معلوم ہؤا کہ راشن ڈیپارٹمنٹ میں رشوت بڑے زوروں سے چل رہی ہے، بڑا بابو بڑی رقمیں ہضم کر جاتا ہے، ٹھیکے اُنہیں کو ملتے ہیں، جو اُس کی مٹھی خوب گرم کر سکتے ہیں، ٹھیکیدار یہ رقم پبلک سے وصول کرتے ہیں۔ لوگوں کو گلا سڑا مال کھانے کو ملتا ہے، سُن کر مجھے طیش آ گیا۔........ میں نے طے کر لیا

کہ اُسے ضرور اُس کی سزا دی جائے گی۔ اور دوسرے ہی دن پولیس نے دام بچھا کر ہیڈ کلرک کو پھانس لیا۔

مجرم میرے سامنے لایا گیا۔ میں نے کہا ——

"خوب غریبوں کا خون چوسا ہے تم نے۔ اب جیل میں چکی پیسنا" بوڑھا کلرک میرے قدموں پر گر گیا۔ گڑگڑا کر کہا ——

"مجھے معاف کیجئے۔ پانچ جوان لڑکیوں کی شادی کرنا ہے۔ پیسہ پاس نہیں، آپ جانتے ہیں کہ ہمارے یہاں بغیر جہیز دیئے..... لڑکی کنوئیں میں بھی نہیں دھکیلی جا سکتی"۔ میں نے طیش کھا کر کہا ——

"جہنم میں جاؤ تم اور تمہاری لڑکیاں، مجھے اس سے کچھ سروکار نہیں۔ تم پر کیس چلے گا، تمہیں سزا ہو گی۔ کرنی کا پھل ملے گا۔"

"کرنی کا پھل........" اُس کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے، وہ رو پڑا۔ مگر وہاں کسے فرصت تھی۔ اُس کے اشکوں کی حقیقت جاننے کے لئے۔ یہ پہلا شکار تھا ہمارے ڈیپارٹمنٹ کا۔ پھر میں اسے کیونکر چھوڑ دیتا۔ چھ ماہ تک مقدمہ چلتا رہا۔ بڑے بڑے وکیل بیرسٹر اُس کی پیروی کے لئے آئے۔ گھر کی ساری کمائی، بیوی کے زیورات، ماں باپ کی رکھی ہوئی چیزیں سب کچھ ختم ہو گئیں۔ اور آخر میں فیصلہ ہوا دو سال کی سخت سزا۔

میں خوشی سے پھول گیا۔ پولیس نے سچ مچ بڑی مستعدی سے کام کیا تھا۔ نہیں تو مقدمہ ہر قدم پر ہر سکتا تھا۔ میں نے پولیس انسپکٹر کی ترقی کے لئے سفارش کی۔

خبر ملی کہ جیل کے پھاٹک تک پہنچتے پہنچتے اُس بوڑھے کلرک نے جو اب تک ضمانت پر رہا تھا۔ خودکشی کر لی۔ اُس نے زہر کھا لیا۔

میرے کلیجے پر سانپ لوٹ گیا۔ اُف!

ایک رشوت خور آدمی بھی ایسا کر سکتا ہے۔

آہ! اب کیا ہو گا؟ اُس کے بیوی بچوں کا —— پانچ جوان بیٹیوں کا........ اور کچھ دنوں بعد اس سے بھی دردناک خبر سننے میں آئی کہ اُس بوڑھے کی بیوی پاگل ہو گئی ہے۔ اور اُس نے اپنا سر دیوار سے ٹکرا دیا ہے۔

بازار کی گلیوں سے پکڑ کر پولیس اُسے جیل لے گئی ہے۔ اب مجھ سے نہ رُکا گیا۔ یہ سب کچھ میرے کرتوت کا نتیجہ تھا۔ میں نے ایک کلرک کی زندگی پر کیوں نہ نظر ڈالی؟ اُس کی تنخواہ پر کیوں نہ غور کیا، اس بات کو کیوں نہ سوچا؟ کہ........ آخر وہ رشوت کیوں لیتا تھا؟ میں ایک ہندوستانی ہوں۔ مگر ہندوستانی ہو کر بھی میری سمجھ میں یہ کیوں نہ آیا کہ جتنی تنخواہ یہ غریب کلرک پاتے ہیں۔ اُس سے کہیں زیادہ خرچ ایک........ انگریز افسر کے ولایتی کُتے پر ہو جاتا ہے۔ پھر یہ بیچارے کیونکر گزارہ کریں اور اُس کے ساتھ —— پانچ جوان بیٹیوں کی شادی اُن کا جہیز —— سماج کی رسم۔

سوچتے سوچتے میرا دماغ چکرا گیا۔ میں اپنی ہی نظر میں سب سے بڑا مجرم دکھائی دینے لگا۔ ایک کلرک کا خون میرے سر پر چڑھ کر بولنے لگا۔

میں جیل پہنچا۔ لوہے کی سلاخوں کے اندر وہ پگلی بند تھی۔ بوڑھے کلرک کی جوان بیوی، دیکھ کر کلیجہ دہل گیا۔ اور جب اُس نے سر اوپر اُٹھایا۔ آنکھوں سے آنکھیں ملیں۔ تو ایسا معلوم ہوا جیسے سینکڑوں بچھوؤں نے ایک ساتھ میرا منہ نوچ لیا ہے۔ میرے سامنے اُس وقت سوا بملا کے اور کوئی نہ تھا۔ اُف! میں نے بملا کے شوہر کی جان لی تھی۔ مجھے دیکھ کر جیسے ایک بار بملا کو ہوش آیا، وہ مسکرائی۔ مسکرا کر ہنسی۔ ہنس کر ایک زور کا قہقہہ لگایا! —— پاگلوں کا قہقہہ کہا۔

"تم یہاں بھی آ گئے مجھے چھیڑنے۔ میں سمجھتی تھی۔ تم چھیڑنا جانتے تک نہیں۔ مگر ماں کہا کرتی تھی —— "تم مجھے چھیڑو گے"۔

اور اُس کے بعد پھر بملا نے دیوار سے سر دے مارا۔ وہ بے ہوش ہو گئی، اُسے پھر ہوش نہ آیا۔

بہت ضروری

(۱) تبدیلی پتہ کی اطلاع ہمیں ہر حالت میں ۵ر تاریخ تک پہنچ جانی چاہیئے (۲) خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر ضرور لکھیئے۔ ورنہ ہزارہا خریداروں میں سے آپ کا نام تلاش کرنا بہت دشوار ہے جبکہ ایک ایک نام کے کئی کئی خریدار ہوتے ہیں (۳) جواب طلب امور کیلئے جوابی خط لکھئے۔

مینجر رسالہ بیسویں صدی بیرون شاہ عالمی دروازہ۔ لاہور

پپیہے نے کہا پی!

از
شاعرِ شباب حضرت مجید لاہوری

تھوڑی سی اگر تُو نے جو یُوں پی بھی تو کیا پی
یہ جام یہ شیشہ یہ صراحی ہے اُٹھا، پی!

کہتی ہیں اُدھر دیکھ وہ گھر گھر کے گھٹائیں
اے بے خبرِ کیفِ مسرت اِدھر آ، پی!

ہاں دستِ قضا تجھ کو تھپک کر نہ سُلا دے
رہنا ہے اگر زندہ تو اے مردِ خُدا، پی!

بہکائے تجھے کوئی تو پی اور بہک جا
ہاں بہکی ہُوئی باتوں پہ ناصح کی نہ جا، پی!

مدت سے ترے سر پہ قضا کھیل رہی ہے
کچھ دیر میں مِٹتا ہے ابھی خوفِ قضا، پی!

ہوش و خرد و عقل، تباہی پہ تُلی ہے
کس فکر میں ہے، جامِ مئے ہوشربا، پی!

ایسے میں بھلا کیسے ہو پینے میں تامّل
وہ آم کے پیڑوں پہ پپیہے نے کہا، پی!

کہتا ہے کوئی تجھ کو بُرا، شوق سے کہہ لے
اچھا ہے تو، ماتھے پہ شکن کوئی نہ لا، پی!

زندہ ہے تو پھر پی کے ہو یُوں زندوں میں شامل
مر کھپ کے کہیں خلد میں گر پی بھی تو کیا، پی!

میخانے میں کیسا حرم و دیر کا جھگڑا
آ اور حرم و دیر کے جھگڑوں کو مٹا، پی!

مسجد میں اذاں سُن کے گئے سارے نمازی
میخانے میں سُن قلقلِ مینا کی صدا، پی!

بنتا ہے مجید آپ سے یُوں عابد و زاہد
ہم جانتے ہیں اس کو، پُرانا ہے وہ پاپی

افسانہ

شام کے دھندلکے میں

از

جناب منوّر اشرف

میں کتنی دیر سے پاس بیٹھا تھا، لیکن وہ نہایت بے پروائی سے میز پوش بُننے میں مصروف تھیں، نہ بات نہ چیت، جیسے میں ہوں ہی نہیں۔ بلکہ اس دوران میں اُنہوں نے میری طرف دیکھا تک نہیں۔ مجھے خواہ مخواہ الجھن ہونے لگی ——— "اجی" میں نے کہا۔ "ہم کتنی دیر سے یہاں ہیں اور آپ کو جیسے خبر ہی نہیں ——— کیا میں واقعی اتنا بُرا ہوں کہ آپ میری صورت نہیں دیکھنا چاہتیں .... ذرا نظر تو اُٹھائیے ——— نہیں۔ تو اچھا ذرا مسکرا دیجئے .... یقین مانئے، مسکراتے ہوئے آپ واقعی بہت اچھی لگتی ہیں۔ ہاں ہاں بس۔ ذرا ہنس دو نا۔ بہت اچھی ہو تم ——— وہ ہنسی آئی .... وہ ہونٹ پھڑکنے لگے .... وہ .... وہ ...." میں نے بہتیرا اُکسانا چاہا۔ لیکن اُن کے چہرے کا تناؤ ذرا بھی کم نہ ہوا۔ وہ اُسی طرح منہ پھلائے کروشیا دھاگا لئے مکھیاں مارتی رہیں ———

"یہ آپ ہر وقت جال سے کیوں تنتی رہتی ہیں ——— کسے اسیر کرنے کے ارادے ہیں آخر؟" میں نے پہلو بدلا۔ داؤ کامیاب رہا۔

"دیکھو ارشد۔ میں کہتی ہوں تم اب بہت کھُلتے جا رہے ہو"۔ وہ تڑپ کر بولیں۔ "مجھے یہ بالکل پسند نہیں۔ جو منہ میں آیا۔ پھٹ سے کہدیا۔ ہوں ...."

"اوہو تو آپ کو میری باتوں سے نفرت ہونے لگی ——— کہیں توبہ ہی لوں؟"

"لیکن یہ تم اتنے بے تکلف کیوں ہوتے جا رہے ہو۔ پہلے تو تم سے بات نہ ہوتی تھی"۔ اُنہوں نے مجھے کنکھیوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ بارے شکر ہے۔ اُنہوں نے میری طرف دیکھا تو ——— ورنہ میں تو مایوس ہی ہو چلا تھا۔

"یہ آپ کی بھول ہے محترمہ۔ میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں"۔ میں نے کسی قدر شاعرانہ انداز اختیار کر لیا۔

"اُف۔ پھر وہی"۔ وہ چیں بجبیں ہو گئیں۔ منہ ایک دم سے انگارے کی طرح دہک اُٹھا۔ یوں محسوس ہوا۔ ابھی چپت جما دینگی۔ مجھے کچھ کچھ کامیابی ہو رہی تھی۔

"اوہ۔ خالہ جان معاف کیجئے گا۔ بھول ہو گئی"۔ میں نے جیسے مرے پر سو دُرّے لگا دیئے۔ وہ ایک دور کے رشتے سے میری خالہ ہوتی ہیں۔ عمر میں مجھ سے کم ہیں۔ اسلئے مذاقاً جب کبھی خالہ جان کہتا ہوں تو چڑ جاتی اور بے نقط سنانا شروع کر دیتی ہیں۔ بہت مزہ آتا ہے اُس وقت۔ وہ تڑپتی ہیں جھلاتی ہیں، بلکہ بعض اوقات تو مارنے کو دوڑتی ہیں۔ اُن کی حالت اس وقت عجب مضحکہ خیز ہو جاتی ہے۔ گھر والے انہیں اس ہیئت میں دیکھ کر ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو جاتے ہیں۔ میری حالت اُس وقت ایک فاتح کی سی ہوتی ہے، اُن کی ننھی ننھی دھمکیوں اور خفگی کا مجھے ذرا ملال نہیں ہوتا۔ اور میں اُن کی حرکتوں سے خوب محظوظ ہوتا ہوں۔ ویسے تو ان سے خدا بچائے۔ مجھے اکثر تنگ کرتی رہتی ہیں۔ اپنی سہیلیوں اور گھر میں آنے جانے والوں کے سامنے اتنا بنائینگی کہ بالکل زچ ہو کر رہ جاتا ہوں۔ لے دے کے میرے پاس ایک یہی ہتھیار ہے جس کی مدد سے میں ان سے انتقام لے سکتا ہوں۔ اندر وہ جز بز ہو کر رہ جاتی ہیں۔ اس وقت بھی وہ سیخ پا ہو گئیں"۔ یہ کیا مذاق ہے آخر۔ ہزار بار کہا ہے۔ کہ مجھے ایسے نہ کہا کرو، لیکن جناب ہیں کہ اثر ہی نہیں ہوتا۔ ہوں۔ بی اے سٹوڈنٹ بنے پھرتے ہیں اور عقل چھو تک نہیں گئی"۔

"جی کیا کہا ——— کیا نہ کہا کروں؟ اوہ یاد آ گیا۔ معاف کیجئے غلطی ہو گئی"۔ میں نے اور دق کیا۔ "ہم آئندہ کبھی خالہ جان نہیں کہونگا۔ اب تو

خوش ہوئیں۔ لیکن آپ بھی اب سے مجھے بھائی جان کہا کیجئے —— اچھا؟
"واہ میں کیوں کہنے لگی بھائی جان تمہیں۔ بھائی بنا کر مجھے کوئی انعام نہیں لینا ہے تم سے —— تم ...... تم تو ......"
اور نہ جانے کیوں اُنکے رخساروں میں گلابی گلابی لہریں دوڑ گئیں اور اُن کی پلکوں میں حسین سا جھکاؤ پیدا ہو گیا۔

"ہوں۔ یہ بات ہے۔ پھر تو میں ضرور خالہ کہکر پکارا کرونگا۔ مجھے واقعی ڈر لگ رہا ہے آپ سے"۔

"ہشت" وہ تلملا گئیں "میں تم سے بولنا نہیں چاہتی" لیکن لہجے کی محبوبیت نے الفاظ کی ترشی زائل کر دی۔ وہ شرما کر رہ گئیں۔ مجھے اس وقت وہ پہلے سے کئی گنا زیادہ اچھی معلوم ہونے لگیں۔

"تو کیا آپ سچ مچ مجھ سے ناراض ہو جائیں گی" میں نے موقع سے پورا فائدہ اُٹھانا چاہا۔ "ہائے ری قسمت ...... او خدا ...... اب تو زندہ درگور ہو گئے" —— اور وہ جھلا کر میز پوش سمیٹتی ہوئی چل دیں۔ میں نے لپک کر دھاگا پکڑ لیا۔ اُنہوں نے جھٹک کر چھڑانے کی کوشش کی۔

"یہ دھاگے اتنے کچے نہیں محترمہ جو یونہی ٹوٹ جائیں" میں نے مسخرہ پن سے کہا۔ لیکن اُنہوں نے جھٹکا دیکر دھاگا توڑ لیا۔ اور دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔ مجھے بہت تعجب ہوا۔ آج اُن کا انداز کچھ بدلا ہوا سا تھا، کالج سے آنے پر بھی وہ مجھے نظر نہ آئی تھیں۔ شاید کسی کام میں مصروف تھیں، ورنہ پہلے تو ڈیوڑھی میں داخل ہوتے سب سے پہلے اُنہیں سے ملاقات ہوا کرتی تھی۔ میری نظروں نے ان کی تلاش میں گھر بھر کا طواف کر لیا۔ اور آخر میں نے اُنہیں ڈھونڈ نکالا۔ لیکن وہ مجھے دیکھ کر مسرت کا اظہار کرتیں یا میٹھے میٹھے الفاظ میں معذرت پیش کرتیں۔ اُلٹا منہ پھلائے رکھائی سے بیٹھی رہیں۔ اور پھر میرے روکنے پر بھی بے اعتنائی سے چل دیں۔ مجھے کچھ کچھ تاسف ہونے لگا۔ آخر یہ بے رخی کیسی؟ —— خیال ہوا شاید یہ بھی ایک ادا ہو، وہ کبھی کبھی اسی طرح بے وجہ روٹھ جایا کرتی ہیں۔ میں بُلاتا ہوں وہ اور اینٹھ جاتی ہیں پھر آہستہ آہستہ تھوڑی دیر تک اس تکرار پہ ہنسکر باتیں کیا کرتے ہیں —— ان کی یہی باتیں تو ہیں۔ جو مجھے اُن کا گرویدہ بنائے دیتی ہیں ...... وہ یونہی روٹھی ہوئی ہیں ...... میرے دل پر چھائے ہوئے سوچ کے سیاہ بادل چھٹ گئے اور میں مسکراتا ہوا دوسرے کمرے میں پہنچ گیا۔

"آپ مجھ سے بھاگ کر جائیں گی کہاں۔ میں تو جہنم تک آپ کا پیچھا نہ چھوڑونگا" لیکن خلاف توقع وہ ذرا بھی ملتفت نہ ہوئیں۔ اور منہ دوسری طرف کئے کام میں لگی رہیں۔ اب تو میری حیرت اور بڑھی۔ اور کسی قدر خفت بھی محسوس ہونے لگی۔ پھر بھی میں نے ایک آخری کوشش اور کی۔ "اچھا صاحب اگر بُرا مانتی ہیں تو میں چلا جاتا ہوں" اور دروازے کی طرف قدم بڑھائے۔ خیال تھا وہ مجھے بلا لیں گی۔ لیکن اُنہوں نے گھوم کر دیکھا تک نہیں۔ اب تو مجھے بھی غصہ آگیا۔ میں زمین پر زور زور سے پاؤں مارتا ہوا اپنے کمرے میں چلا آیا اور پاؤں پھیلا کر پلنگ پر لیٹ گیا۔ لیکن دماغ عجیب الجھن میں گرفتار تھا —— آج یہ اُن کے تیور کیوں بگڑے ہوئے ہیں —— وہ بدلی بدلی سی کیوں نظر آ رہی ہیں —— ؟ بہتیرا سر مارا لیکن کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔ مجھے پڑھائی کے سلسلے میں اُن کے ہاں رہتے ہوئے کافی عرصہ ہو چکا تھا۔ اور آج تک کبھی یہ نوبت نہ آئی تھی، وہ روٹھ تو اکثر جایا کرتی تھیں۔ لیکن ذرا سی خوشامد پر مان بھی جایا کرتی تھیں اور یوں ہو جاتیں جیسے کچھ ہوا ہی نہیں —— لیکن آج تو انتہائی کوشش کے باوجود میں اُن کے چہرے پر نرمی لانے سے قاصر رہا تھا۔ بلکہ وہ اُلٹا چڑ گئی تھیں۔

"آخر اُن کی ناراضی کا سبب کیا ہے؟" —— کوئی معقول وجہ دماغ میں نہ آ رہی تھی —— "نہ معلوم یہ کونسے جرم کی سزا مل رہی ہے؟ میرے دماغ میں سرعت سے ایک خیال پیدا ہوا۔ اور راسخ ہو کر رہ گیا۔ نادانستہ مجھ سے ایک غلطی سرزد ہو چکی تھی۔

رات میں اُن کی چچیری بہن فرخندہ کو اُس کے گھر چھوڑنے چلا گیا تھا۔ اُنہیں کے پاس بیٹھے بیٹھے اُسے دیر ہو گئی۔ اندھیرے کے خیال سے بیچاری کا دم خشک ہوا جا رہا تھا۔ جاتے ہوئے اس نے ملتجی انداز سے میری طرف دیکھا۔ میں نے ترس کھا کر ساتھ جانے کی حامی بھر لی۔ اس کا گھر دور نہ تھا۔ مجھے جلد لوٹ آنا تھا۔ وہاں پہنچے تو اس میں میرا کیا قصور کہ وہ مجھے زبردستی اپنے کمرے میں لے گئی۔ اور اپنی تازہ بنائی ہوئی تصویریں دکھانے لگی۔ میں اتنا بدذوق تو ہوں نہیں کہ ایک فنکار کے کمال کی داد نہ دوں۔ میں نے ایک ایک

تصویر کو غور سے دیکھا اور عش عش کر اُٹھا۔ تصویریں واقعی شاہکار تھیں۔ مجھے کچھ دیر ہو گئی، فرخندہ کے کمرے سے نکلا تو اس کی امّی گھیر بیٹھیں اور لگیں اِدھر اُدھر کی ہانکنے۔ بمشکل اُن کی چٹ پٹی باتوں سے چھٹکارا حاصل کیا اور بھاگم بھاگ گھر آیا۔ مجھے اسی وقت خطرے کا کچھ کچھ احساس ہو گیا تھا کیونکہ جب میں کپڑے اُتار کر سونے کی تیاری کر رہا تھا، وہ دروازے میں نظر آئیں "مل گئی چھٹی ؟ میں سمجھی آج آپ نہیں آئیں گے۔ خوب جی بھر کر باتیں ہوئی ہوں گی تنہائی میں ؟" میں سناٹے میں آگیا۔ اور اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا وہ جا چکی تھیں ...... اُف اتنی غلط فہمی ...... ساری رات میں عجیب اُدھیڑ بُن میں رہا ...... اُنہوں نے میرے متعلق کتنا غلط اندازہ کیا تھا۔ آخر انہوں نے کیا سمجھ لیا تھا ؟

کسی حد تک وہ بھی حق بجانب تھیں، وہ کم بخت فرخندہ میری شکل وصورت اور سُریلی آواز کی مداح تھی، وہ ہر بات میں میری طرفداری کیا کرتی اور اکثر اُن سے میرا گانا سننے کی فرمائش کیا کرتی۔ اور یہ سب کچھ انہیں بہت بُرا محسوس ہوتا۔ انہیں شاید یہ ہرگز گوارا نہیں کہ کوئی میری تحسین و توصیف کرے، یا مجھ سے کسی طرح کی اپنائیت ظاہر کرے۔ وہ فرخندہ کو اس طرح کی باتوں پر اکثر ٹوک دیا کرتی تھیں۔ اور وہ بیچاری کھسیانی ہو کر رہ جاتی۔ انہیں فرخندہ سے کچھ جلن سی ہو گئی تھی۔

خیر یہاں تک تو کوئی بات بھی تھی، اُدھر شامتِ اعمال سے ایک دن میں اُن کے سامنے فرخندہ کے سنہری بالوں اور نیلی آنکھوں کی تعریف کر بیٹھا۔ اُس کے لانبے لانبے ریشمیں بال اور نیلی نیلی سیاہی مائل آنکھیں سُرخ و سپید رنگت پر بہت بھلی معلوم ہوتی تھیں۔ اچھی چیز کی تعریف کر دینا کونسا گناہ ہے، اور پھر میں نے یونہی باتوں باتوں میں کہہ دیا تھا۔ اس تحسین میں مطلق میری کسی غرض کو دخل نہ تھا۔ لیکن اُن کا شکّی دماغ جانے کیا کچھ سمجھ بیٹھا۔ آخر عورت ہیں نا! ـــــ میری اس ذرا سی بات نے اُن کے جذبات کی دہکتی ہوئی بھٹی پر تیل کا کام کیا۔ اُن کی آنکھیں شرربار ہو گئیں اور وہ ناک بھوں چڑھا کر مجھے کڑوے تیوروں سے گھورتی ہوئی اُٹھ کر چلی گئیں۔ مجھے اسی وقت کچھ کھٹکا ہوا تھا۔ پھر رات میں اتنی دیر تک فرخندہ کے ہاں بیٹھا رہ گیا تھا۔ اب تو معاملہ اور بھی صاف تھا۔ جب دونوں طرف یہ حالات ہوں تو غلط خیال قائم کر لینا کونسی بڑی بات ہے۔

مجھے ندامت ہونے لگی، جتنا خیال دوڑاتا، اپنے آپ کو اتنا ہی قصوروار پاتا ـــــ "بھلے مانس۔ کوئی پوچھے۔ پرائی لڑکیوں کی اس بے جا مدح وستائش کا آخر مطلب کیا ہے ؟ پھر یوں تنہائی میں ملاقاتیں ـــــ" میں کانپ گیا۔ غلطی واقعی میری ہی تھی ......

پلنگ پر لیٹا کتنی دیر تک خیالات کی لہروں میں ہچکولے کھاتا رہا۔ اپنی نظروں میں میں بے گناہ تھا۔ لیکن اُن کے سامنے اپنے آپ کو بے قصور ثابت کرنا ذرا ٹیڑھی کھیر تھی، کیونکہ جب وہ کسی بات پر اڑ جاتی ہیں، تو سمجھانا مشکل ہو جاتا ہے، رات ہی مجھے خیال تھا۔ کہ صبح اُٹھ کر اپنی پوزیشن واضح کر دونگا۔ تاکہ ان کے دل سے یہ ناحق کی بدگمانی دور ہو جائے۔ لیکن آنکھ کھلتے ہی اسلم سر پر موجود تھا۔ اس کے ساتھ ٹینک پر جانا پڑا۔ واپس آیا تو کالج کا وقت ہو چکا تھا۔ اس لئے ان سے بات نہ کر سکا۔ نہ اُنہوں نے بلانے کی زحمت گوارا کی۔ دوپہر کو گھر لوٹا۔ تو انہیں کُپّا بنی دیکھ کر کچھ کہنے کی ہمت نہ ہوئی، بلکہ میں نے منانے کے بہتیرے جتن کئے اور وہ ماش کے آٹے کی طرح اینٹھی ہی رہیں۔ اُن کے اس تلخ رویہ کے پیشِ نظر اپنی صفائی دینا مجھے کسی صورت منظور نہ تھا۔ اس سے میری خودداری کو ٹھیس لگنے کا اندیشہ تھا، باوقار مصالحت کی کوئی راہ دکھائی نہ دیتی تھی۔

خیالات کے اسی تانے بانے میں میرا دماغ خالی ہو کر رہ گیا۔ مجھ پر غنودگی سی طاری ہونے لگی۔ اچانک میرے ذہن میں ایک دل خوش کن خیال آیا۔ اور میرا دماغ سکون پذیر ہو گیا۔ "ابھی تھوڑی دیر میں یہ خود ہی میری منتیں کریں گی۔" انہیں زنانہ دستکاریوں کی نمائش میں اپنے ایک رومال پر انعام ملا تھا۔ اور اسی خوشی میں اُن کی سہیلیوں نے اُن سے پارٹی طلب کی تھی۔ اور آج شام کا پروگرام طے ہو چکا تھا۔ ایسے کاموں میں اُنہیں اکثر میری ضرورت پڑا کرتی ہے، میں اگر اکڑ جاؤں، تو وہ ہزار ہزار منتیں کر کے مجھے منا لیتی ہیں۔ اس وقت بھی مجھے یہی خیال تھا۔ کہ وہ ابھی آ کر جھکی جھکی شرمائی ہوئی نظروں سے اظہار ندامت کرینگی اور شام کے پروگرام میں حصہ لینے کے لئے درخواست کریں گی ...... یوں دل ہی دل میں خوش ہوتا ہوا منہ لپیٹ کر سو گیا۔

جب میں بیدار ہوا تو ساتھ کے کمرے میں اُن کی امّی کی آواز سُنائی دی "ارشد کو جگا لیا ہوتا مٹھائی اور پھل وغیرہ لے آتا۔"

"نہیں انہیں کیا تکلیف دینی ہے" جواب میں اُن کی روکھی روکھی آواز

آئی۔ "رہو کس مرض کی دوا ہے، خود ہی لے آئیگا جاکر"۔

اب تو میں بھی جل گیا ...... نہیں تو نہ سہی، ....

میں کونسا مرا جا رہا ہوں۔ کہ ضرور مجھ سے منگواؤ ...... ہوں، مزاج آسمان پر ہے۔ اتنی منتیں کی ہیں۔ اب کیا پاؤں پکڑوں بیگم صاحبہ کے واہ یہ بھی اچھی رہی۔ بات کوئی ہے نہیں۔ اور خواہ مخواہ طول دیا جا رہا ہے۔ .... میں نے کروٹ لیکر پھر سے سو جانا چاہا، لیکن دماغ میں تو ہیجان برپا تھا۔ کتنی دیر تک کروٹیں لیتا رہا لیکن نیند نہ آئی۔ رہ رہ کے یہی خیال آرہا تھا، کہ وہ مجھ سے برگشتہ ہو چکی ہیں ——— "کہیں یہ سردمہری نفرت میں نہ بدل جائے" ——— میرا دم گھٹنے لگا۔ میرے خدشات باطل نہ تھے۔ اُنہوں نے میرے کمرے میں جھانکا تک نہیں ..... تو کیا انہیں واقعی ......؟

بہت دیر تک اس ذہنی اذیت میں مبتلا رہا، میرا دماغ سن سن کرنے لگا۔ اور کنپٹیوں اور آنکھوں پر ایک عجیب طرح کی گرانی محسوس ہونے لگی، میری پریشانی بڑھتی جا رہی ہے، اچانک میرے دماغ میں ایک خیال نے سر نکالا "امان چھوڑو۔ جب انہیں کوئی پرواہ نہیں تو تم کیوں مرے جا رہے ہو ——— اُنہیں غرض ہو گی، تو ایک بار چھوڑ دس بار بلائینگی۔ اس طرح کڑھنے سے فائدہ؟" .... اور میں اُٹھ کر غیر ارادی طور پر غسل خانے کو چل دیا۔ نہا کر نکلا، طبیعت بجھی بجھی سی تھی۔ ساتھ کے کمرے میں وہ پارٹی کے انتظام میں مصروف تھیں۔ نسیمہ آئی ہوئی تھی اُس نے دو ایک دفعہ میرا ذکر کیا بھی۔ لیکن اُنہوں نے کوئی خاص توجہ نہ دی، میں جلا ہوا تو تھا ہی، اسلئے سیر کے لئے جانے کی نیت سے جلد جلد کپڑے پہن اسلم کا انتظار کرنے لگا۔ وقت گزاری کے لئے میز پر پڑے ہوئے اخباروں اور رسالوں کو اُلٹ پلٹ کرتا رہا، کمرے میں چکر لگاتے لگاتے ٹانگیں دکھنے لگیں۔ لیکن اسلم نہ آیا۔ اُکتا کر باہر نکل آیا۔ سوچا شاید راستے میں آرہا ہو۔ اور دروازے میں کھڑا ہو گیا۔ یہاں بھی کتنی دیر ہو گئی۔ اس کا کہیں پتہ نہ تھا، میری بے چینی بڑھنے لگی، لیکن اس بیچارے کو کیا معلوم تھا۔ کہ مجھے آج اس کی اتنی ضرورت ہے اور اسے جلد آجانا چاہئے تھا۔

کھڑے کھڑے مایوس ہو کر لوٹنا چاہتا تھا۔ کہ عذرا اور فرخندہ تانگے میں آتی ہوئی دکھائی دیں، فرخندہ مجھے زہر معلوم ہوئی۔ آج کے تلخ واقعات کی وہی تو ذمہ دار تھی، میں چاہتا تھا اس کی صورت نہ دیکھوں۔

"آداب۔ بھائی جان"۔ عذرا نے قریب آکر کہا اور جواب میں میرے ہونٹ مبہم سے ہل کر رہ گئے۔

"کہئے مزاج شریف"؟ فرخندہ نے حسبِ معمول شوخی سے میری طرف نقاب اُٹھاتے ہوئے کہا۔ "اچھے تو ہیں؟" ——— مجھے اس وقت یہ ادا اور بھی بُری معلوم ہوئی۔

"جی، بس جی رہے ہیں آپ کی مہربانی سے"۔ میں نے انتہائی نفرت سے جواب دیا۔

"ارے بھائی جان"۔ عذرا حیرانی سے بولی۔

"کیا بات ہے۔ مارا ہے کسی نے؟ روٹھے سے دکھائی دے رہے ہیں"۔ فرخندہ نے جیسے بدلہ لیا۔ "عذرا، کہیں یہ بھی تو تانک جھانک نہیں کر رہے تھے"۔

"ہاں ہاں بھائی جان، کوئی ایسی ویسی بات تو نہیں ہو گئی۔ ابھی رستے میں ہم نے ایک لڑکے کو پٹتے دیکھا ہے۔ شریف زادے بازار میں دل لگی کر رہے تھے"۔ اور میں دانت پیس کر رہ گیا۔

"اچھا تو اندر آیئے"۔

"جی نہیں آپ تشریف لے جا سکتی ہیں"۔ میں نے بیزار ہو کر کہا۔

"ارے۔ کیا بات ہے۔ کہیں ان سے اَن بن تو نہیں ہو گئی؟" فرخندہ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ "چلئے نا اندر۔ میں آپ کو لے کر جاؤں گی"۔ اور میرے انکار پر اس نے مجھے کھینچنا شروع کر دیا۔ دوسری طرف سے عذرا گھسیٹنے لگی، میری حالت مضحکہ خیز ہو رہی تھی، میں نے محسوس کیا۔ کہ لوگ یہ تماشا دیکھ رہے ہیں۔ اس لئے چپ چاپ اندر چلا آیا۔

اُنہوں نے پارٹی کا بندوبست کر لیا تھا، وہ سب مٹھائی پر پل پڑیں اور مجھے بھی شریک ہونے کی دعوت دی۔ میں نے سر کی جنبش سے انکار کر دیا۔ اور ایک کونے میں چپکا بیٹھا رہا۔

"اے بیگم صاحبہ کیا بات ہے۔ آج تیور بگڑے ہوئے نظر آرہے ہیں، کیا ہوا تم دونوں کو"؟ فرخندہ ایک پورا گلاب جامن نگلتے ہوئی بولی۔

"کچھ نہیں، ہو گا کیا؟" اُنہوں نے چائے انڈیلتے ہوئے بے پروائی سے جواب دیا۔

"مگر کچھ تو ہے، ارشد یونہی سوگ تھوڑا ہی منا رہے ہیں"

"اتنی ہمدردی ہو رہی ہے تو خود ہی کیوں نہیں پوچھ لیتیں"۔ اُنہوں نے طنز آمیز درشتی سے کہا۔ اور فرخندہ بے چاری اپنا سا منہ لیکر رہ گئی۔ میں دل ہی دل میں اسلم کو نہ آنے پر کوس رہا تھا۔

"مٹھائی بہت ردی ہے"۔ عذرا بولی۔

"بناسپتی معلوم ہوتا ہے" تسنیم نے تائید کی۔

"اور پیسٹری کونسی اچھی ہے"؟ فرخندہ نے کنکھیوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے ایک پیس منہ میں ٹھونستے ہوئے کہا۔ "شاید کسی کباڑیئے کی دکان سے اُٹھا لائے ہیں"۔ وہ سب سمجھ رہی تھیں کہ یہ چیزیں میں لایا ہوں۔

وہ جل اُٹھیں "۔ کیوں اچھی ہونے لگی بھلا۔ اُن کے ہاتھ جو نہیں لگے"۔

"یہ فرخندہ پر براہ راست چوٹ تھی۔

"اوہ یہ بات ہے"۔ فرخندہ سنجیدہ ہو گئی۔ "بھئی ہم بھی جانیں۔ آخر معاملہ کیا ہے۔ تم لوگ کھچے کھچے نظر آتے ہو"۔

"کچھ نہیں۔ کچھ بھی تو نہیں"۔ ہم دونوں بیک آواز بولے، اور میں نے تنگ آ کر بھاگ جانا چاہا۔ لیکن ان سب نے مجھے گھیر گھار کر پھر سے لا بٹھایا۔

"بھئی یہ بات ٹھیک نہیں"۔ نسیمہ بولی "جب تک ارشد بھائی شامل نہ ہوں گے۔ ہم لوگ بھی کچھ نہ کھائیں گے"۔

"ہاں ہاں ٹھیک ہے"۔ اور سب نے اپنے اپنے کپ رکھ دیئے۔ میں نے بہت اُوں آں کی، لیکن کون سنتا تھا۔ مجبوراً اور راہ نکالنی پڑی۔ "مجھے افسوس ہے کہ میں شریک نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ مجھے مدعو نہیں کیا گیا"۔ ان کا رنگ اُڑ گیا۔

"اچھا تو ہم آپ کو دعوت دیتے ہیں۔ امید ہے آپ ہماری بات کو رد نہیں کرینگے"۔ لڑکیاں بولیں۔

"جی نہیں۔ بھلا آپ کون ہیں"۔ میں نے جواب دیا۔ "ہاں اگر خالہ جان درخواست کریں تو سوچا جا سکتا ہے"۔

وہ خلاف معمول خالہ کے خطاب پر بدک اُٹھنے کی بجائے آہستہ سے بولیں "۔ آیئے۔ آیئے نا ارشد صاحب" اور میں نے اپنی کرسی اُن کے قریب کھسکا لی۔ مجھے چائے دی گئی، فرخندہ نے دو تین کریم رول اور پھل میرے آگے ڈال دیئے۔ اُنہوں نے رسگلوں کی پلیٹ میری طرف سرکا دی۔ اور پھر سب نے باری باری کچھ نہ کچھ میری طرف بڑھا دیا۔ میرے سامنے ڈھیر لگ گیا۔ میں نے بھی سوچا اب شرم کا ہے کی۔ جی کھول کر ہاتھ صاف کرو۔ بعد میں دیکھا جائیگا۔ چنانچہ ایک رسگلا اُٹھا منہ میں ڈال لیا۔ معاً میری نظر اُن پر جا پڑی۔ اُن کی نظروں سے نفرت اور سرد مہری ٹپکی پڑتی تھی۔ رسگلہ میرے حلق میں اٹک کر رہ گیا۔ میں نے جلدی سے چائے کا کپ ختم کیا۔ اور ہاتھ پونچھ کر اُٹھ کھڑا ہوا۔

"ارے بس؟ کھایا کیا ہے آپ نے"۔ تسنیم بولی "آپ تو لڑکیوں سے زیادہ شرما رہے ہیں"۔ اور سب کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ شریر کہیں کی، مجھے غصہ تو بہت آیا۔ لیکن منہ چڑا کر رہ گیا۔ خدا بچائے ان لڑکیوں سے۔

"سُنا ہے بھائی جان فوج میں کیپٹن بننا چاہتے ہیں"۔ نسیمہ بولی

"اور کھائیں گے نہیں تو فوج میں کون لیگا"؟ عذرا نے کہا۔

"ہوں، شکل دیکھی ہے کیپٹن صاحب کی" اب ان کی باری تھی۔ "ان سے تو میں ہی اچھی ہوں، پونے دو فٹ کا قد اور چلے ہیں کیپٹن بننے"۔

اب تو انتہا ہو گئی۔ کمرہ نسوانی قہقہوں سے گونجنے لگا۔ میں نے محسوس کیا کہ انہیں صرف میری تضحیک مقصود تھی۔ میں سٹپٹا اُٹھا۔ اُف یہاں تک نوبت آ گئی ——— میرے منہ سے بات نہ نکلتی تھی۔ جانے میری حاضر جوابی کو کیا ہو گیا تھا۔ جی یونہی رونے کو چاہ رہا تھا۔ میں اپنے کمرے میں چلا آیا اور دھڑام سے چارپائی پر گر پڑا۔ رہ رہ کے یہی خیال ستا رہا تھا کیا وہ واقعی مجھے دل سے اُتار چکی ہیں، ——— کیا میں انہیں اب تک غلط سمجھتا رہا ——— ؟ میرے معبود۔ اب کیا ہو گا۔ میں نے تو تصور میں کتنی رنگین دنیائیں آباد کر رکھی تھیں ——— کیا یہ سنہری سپنے یونہی بکھر کر رہ جائیں گے۔ . . . . . . میری آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ اُن کی برہمی کی وجہ سمجھ میں نہ آ رہی تھی۔ اگر ان کی برگشتگی صرف فرخندہ کی وجہ سے ہوتی تو کوئی بات نہ تھی، لیکن وہ شاید مجھے حقیر سمجھنے لگی تھیں۔ اُن کی نظروں میں میری کوئی وقعت نہ رہی تھی . . . . . .

خیالات کی اسی اُدھیڑ بن میں غلطاں و پیچاں تھا۔ کہ وہ سب گلے میں پھولوں کے ہار ڈالے دندناتی ہوئی نازل ہو گئیں، میں نے ایک کتاب اُٹھا کر آنکھوں کے سامنے کر لی۔

"اوہو۔ یہاں پڑھائی ہو رہی ہے"۔ فرخندہ بولی "۔ اتنی محنت نہ کیا

کیجئے، ورنہ صحت خراب ہو جائیگی"۔

"شکریہ"

"چھوڑیئے بھی بھائی جان کوئی بات کیجئے نا"۔ عذرا نے کتاب چھیننے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"پڑھنے بھی دو، آخر تمہیں کیا پڑی ہے"۔ وہ بولیں۔ "جب انہیں آدم بیزاری ہو رہی ہے، تو ہم کیوں منتیں کرتے پھریں"۔ اور میں اور بھی انہماک سے پڑھنے لگا۔

"اونہہ ہوں۔ میں نے بھی کہا"۔ کمرے میں خشکی کیوں پھیل رہی ہے"۔ تسنیم مٹکتی ہوئی آئی اور جھپٹا مار کر کتاب اڑا لی۔ "اتنی موٹی موٹی اور روکھی روکھی فلسفہ کی کتابوں سے آپ کو ملے گا کیا، یہ وقت تو ہنسنے کھیلنے اور خوشی منانے کا ہے۔ کیا آپ کو ہماری موجودگی بری محسوس ہو رہی ہے"؟

"آں۔ نہیں۔ نہیں تو"۔ میں نے ازراہ تکلف جواب دیا۔ حالانکہ ان سب کا وجود مجھے سخت ناگوار گذر رہا تھا۔

"میرے خیال میں اب بھائی جان سے گانا سننا چاہیئے" نسیمہ مسکراتے ہوئے بولی۔

"ہاں ہاں ضرور" فرخندہ چہک اٹھی۔ "ذرا سفارش کر دو نا بوا"۔

"نہ بنو مجھے تو معاف ہی رکھو"۔ وہ تنک کر بولیں۔ "تم ہی کیوں نہیں کہہ دیتیں۔ آجکل ذرا تمہاری سفارش چلتی ہے"۔

فرخندہ چپ سی ہو گئی۔ اُن کی ان تلخ تلخ باتوں سے محفل پر مردنی چھا گئی۔ میں نے اکتا کر باہر جانے کا قصد کیا۔

"نسیمہ ان سے کہو کہاں جا رہے ہیں"؟ اُنہوں نے فقرہ کسا۔ "فرخندہ بی کو گھر چھوڑنے کون جائیگا" ——— میں اور بھی چڑ گیا۔ اور فرخندہ نے اپنی صلح جو طبیعت کے زیر اثر صرف خاموش رہنے پر اکتفا کی۔

"واہ بنو چاہتے ہی پر ٹرخانا چاہتی ہو؟ ہم تو سینما دیکھیں گے"۔ تسنیم نے دیدے مٹکاتے ہوئے کہا۔

"ہاں ہاں اور بھائی جان ہمارے ساتھ جائیں گے" عذرا بولی۔

"مجھے افسوس ہے۔ میں آپ کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ مجھے ایک ضروری کام ہے"۔

"ارے پھر وہی"، تسنیم بولی۔ "آخر تم دونوں کا غصہ کب دور ہوگا اچھا میں تمہاری صلح کرائے دیتی ہوں۔ لانا تو عذرا پانچ پیسے کے بتاشے یہ کیا یاد کریں گے"۔

"صلح کیسی، ہم کونسے لڑے ہوئے ہیں"۔ اُنہوں نے کہا۔

"پھر تم دونوں کھل کر کیوں نہیں بولتے" فرخندہ بولی۔ "آخر ہوا کیا ہے"؟

"خیر جانے دو"۔ تسنیم بولی "لیکن سینما؟"

"میں نے کہا۔ کہ میں نہیں جا سکتا"۔ میں نے اپنی شان برقرار رکھنا چاہی۔

"پھر ہم اکیلے کس طرح جا سکتے ہیں"۔ فرخندہ بولی۔

"ہم اسلم کو ساتھ لے چلیں گے" نسیمہ بول اٹھی۔

"وہ نہیں جائیگا۔ ارشد بھائی کے بغیر" عذرا کہنے لگی

"بہتر تھا کہ بھائی جان ابھی مان جاتے"۔ تسنیم نے کہا۔ "لیکن سینما کا پروگرام ملتوی کیا جاتا ہے۔ جس دن بھائی جان کہیں گے۔ اُس دن چلیں گے"۔

"میں تائید کرتی ہوں"۔ عذرا بولی اور سینما کا پروگرام ملتوی کر دیا گیا۔ میری جان چھوٹی اور میں دھیمے دھیمے قدموں سے باہر نکل آیا۔

کئی دن تک میں اُداس اُداس رہا۔ میرا دل کہیں بھاگ جانے کو چاہتا تھا۔ وہ اب تک کشیدہ سی تھیں، رسمی گفتگو کے سوا اُنہوں نے کبھی کوئی بات نہ کی۔ میرے اُن کے کمرے کا ملحقہ دروازہ بھی اب بند کر دیا گیا تھا۔ پہلے درمیان میں صرف ایک باریک سا ریشمی پردہ لہرایا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ اُنہوں نے کبھی اپنی نگاہوں میں میرے لئے نرمی اور لوچ کا اظہار نہ کیا۔ مجھے کمتری کا احساس ہونے لگا۔ اس صورت حالات میں میں اپنی طرف سے کیونکر سلسلہ جنبانی کر سکتا تھا۔ . . . . . . انہیں مجھ سے کوئی لگاؤ نہیں . . . . . . اس کا مجھے شدت سے احساس ہو چکا تھا۔ وہ مجھ سے دور دور ہوتی جا رہی تھیں۔ ہم میں جو انجانے پن میں ایک بے لوث قلبی رشتہ قائم ہو چکا تھا۔ وہ اب ٹوٹتا نظر آ رہا تھا۔ میری دنیا تاریک ہوتی جا رہی تھی۔ میں ہر وقت مضمحل و پریشان سا نظر آتا۔ اسلم مجھے خلاف عادت اس طرح افسردہ دیکھ کر بھونچکا رہ گیا۔ پہلے تو کچھ دیر اوٹ پٹانگ کہتا رہا۔ . . . .

.... پھر سنجیدگی سے بولا " واہ عشق کرنے چلے ہیں حضرات صاحب ابھی تک ابتدائی اصولوں کا علم نہیں، کہو تو ابھی انہیں رام کر لوں، ایک پل میں تمہارے قدموں میں لا ڈالوں تو نام بدل دینا "

میرے خیال میں اُس کی طرف سے یہ کوشش نامناسب تھی، اس لئے میں نے اسے منع کر دیا۔ میری پریشانی دور ہوتی نظر نہ آتی تھی۔ ایک درد تھا کہ ہر لمحہ بڑھتا جا رہا تھا کتنی راتیں اور کتنے دن میں نے رو رو کر کاٹ دیئے۔ لیکن جو آگ اندر ہی اندر سلگ رہی تھی، وہ کسی طرح نہ بجھی۔

اس دوران میں گرمیوں کی چھٹیاں ہو گئیں، والد صاحب کا خط آیا گھر آنے کی بہت تاکید کی تھی۔ کیونکہ اماں جان میرے لئے نہایت بیقرار ہو رہی تھیں۔ میرا دل بھی یہاں لگتا نہ تھا پاس رہ کر غم دوری برداشت نہیں ہو سکتا۔ انہیں میری کونسی پروا تھی دوسرے میں پچھلی دفعہ بھی گھر نہیں گیا تھا۔ اس لئے فوراً چلے جانیکا فیصلہ کر لیا، اور اپنے اس ارادے سے اُن کی امی کو مطلع کیا۔ اُنہوں نے بہت کہتے پر منہ بنا کر جانے کی اجازت دیدی۔ جس وقت میں اُن سے بات کر رہا تھا، مجھے محسوس ہوا۔ وہ باہر کھڑی سُن رہی ہیں۔ اور چپکے سے بغیر کچھ کہے چلی گئی ہیں۔ مجھے اور قلق ہوا۔

میں اپنا بستر اور سوٹ کیس وغیرہ ٹھیک کر رہا تھا۔ کہ ننھا سعید آیا۔

"بھائی جان آپا جان کہتی ہیں ......"

" کیا کہتی ہیں ؟" میں چونک پڑا۔

" کہتی ہیں آپ نہ جائیں "۔

" کیوں ؟"

وہ بے چارا کیا جواب دیتا۔ اُلٹا پریشان ہو گیا۔ مجھے شبہ ہوا۔ وہ برآمدے میں کھڑی ہیں۔ اس لئے قدرے زور سے میں نے کہا۔ " اپنی آپا جان سے کہو، کہ خود ہی کیوں نہیں آجاتیں۔ کیا وہ اب مجھ سے پردہ کرنے لگی ہیں ؟ ویسے ہم رُک نہیں سکتے۔ ضرور جائیں گے۔ اور پھر شاید واپس نہ آئیں "۔ میرا خیال تھا۔ وہ ابھی کچھ بولیں گی۔ کتنی دیر تک کان لگائے دھڑکتے دل سے بیٹھا رہا۔ لیکن جواب ندارد۔ جھنجھلا کر میں نے اپنے نئے سلے ہوئے سوٹ کو توڑ مروڑ کر سوٹ کیس میں بند کر دیا۔

ساری تیاریاں ہو چکی تھیں۔ صبح کی گاڑی سے جانا تھا۔ شام کو یونہی اسلم کے ساتھ گھومنے چلا گیا۔ واپس آیا تو کافی اندھیرا ہو چکا تھا۔ وہ باغیچے کے پرلے کونے میں کھڑی تھیں۔ میں نے سوچا اس وقت یہاں کیا کر رہی ہیں ؟ اس لئے دبے پاؤں آگے بڑھا۔ ان کی پیٹھ میری طرف تھی۔ قریب پہنچا۔ تو میرا رُواں رُواں تھر تھرا اُٹھا اور دل ایک بار اس زور سے دھڑکا جیسے یہ اس کی آخری دھڑکن ہو۔

ان کے ہاتھ میں میری تصویر تھی۔ اور ان کی آنکھیں موتی برسا رہی تھیں۔ میری آنکھوں سے خوشی کے آنسو نکل آئے۔ وہ میری آہٹ پا کر چونک اُٹھیں اور منفعل سی ہو کر بھاگ گئیں ....

دوسرے دن میرا بندھا ہوا سامان کھل چکا تھا۔ اُن کی سہیلیوں نے انہیں خوب خوب چھیڑا اور تنگ کیا۔ مبارکباد پر مبارکباد دی جا رہی تھی۔ قہقہوں سے گھر گونج رہا تھا۔ میں فخر سے اکڑا ہوا تھا اور وہ مارے شرم کے دُہری ہوئی جا رہی تھیں ـــــ گھر میں پھر سے وہی چہل پہل نظر آنے لگی .... اور اسی دن شام کو ہم سب پکچر دیکھنے جا رہے تھے

ـــــــــ

مضمون نگار حضرات سے

درخواست ہے کہ حاشیہ چھوڑ کر خوشخط لکھا کریں اور سطور کے درمیان میں کافی جگہ چھوڑا کریں۔ بعض اچھے مضامین بدخط ہونے کی وجہ سے چھپنے سے رہ جاتے ہیں۔ اپنے پاس اپنے مضامین کی نقل ضرور رکھیں۔ کیونکہ ناقابل اشاعت مضامین ضائع کر دیئے جاتے ہیں۔ نو آموز حضرات مضامین بھیجنے سے پہلے کسی اُستاد سے مشورہ لے لیا کریں اور اگر وہ چاہیں کہ مرسلہ مضامین ناقابلِ اشاعت ہونے کی صورت میں اُنہیں واپس کر دیئے جائیں۔ تو مضمون کے ساتھ ٹکٹ بھیجنے کی بجائے اپنا پتہ لکھا ہوا جوابی لفافہ ارسال فرمائیں۔

ایڈیٹر رسالہ "بیسویں صدی" بیرون شاہ عالمی دروازہ۔ لاہور

خط کا جواب

(از جناب سالکؔ الہاشمی بی اے ایل ایل بی)

جن نگاہوں میں ہو شوخی کی شراب
ظلم ہے اُن کے لئے شرم و حجاب

میں شہیدِ جستجو وہ ماہتاب!
خود ہی مہمل بن گیا لفظِ حجاب

بے شعوری سے تری جانِ شباب
مل گیا سب کچھ مجھے اب کر حجاب

دستِ قاصد پر ہیں وہ پُرزے رکھے
دیکھ لے یہ ہے ترے خط کا جواب

گر پڑا آئینہ اُن کے ہاتھ سے
ہائے آیا بھی تو کب آیا حجاب

اُن نگاہوں کی نہ پوچھو کیفیت
جن سے زاہد نے بھی پی لی ہو شراب

کیوں سُنائی اُن کو اپنی داستاں!
ہائے وہ رُخ اور نمودِ اضطراب!

بہ گئے نا آج آنسو آنکھ سے
ہو گیا نا عشق آخر کامیاب!

ہر ادا میں ہے کبھی ذوقِ نمود
اور کبھی دُنیا کی ہر شے سے حجاب

اپنے سالکؔ سے بگڑ بیٹھے تو ہو
چین آئے تو مرا ذمّہ جناب

غزل

(از جناب پروفیسر پرشوتم لال ضیا ایم اے)

سامنے تجھ کو دیکھتا ہوں میں
کچھ سے کچھ، دیکھ، ہو چلا ہوں میں

بات بنتی نظر نہیں آتی!
اُن کی باتوں سے پا گیا ہوں میں

میری قسمت کو لاگ ہے مجھ سے
بارہا آزما چکا ہوں میں

آ ہی جاتا ہوں اُس کی باتوں میں
اُس کو، ویسے تو، جانتا ہوں میں

چاہتا ہے نہیں جب اک عالم
تم ہی کہہ دو کہ کیوں نہ چاہوں میں

موت بھی زندگی ہے، کہتے ہیں
کس لئے جان دے رہا ہوں میں

میں نہیں جانتا کہ تُو کیا ہے
تُو نہیں جانتا کہ کیا ہوں میں

ابتدا یہ کہ ساز ہوں غم کا
انتہا یہ کہ بے صدا ہوں میں

کہتے ہیں ہیچ ہے ضیاؔ، لیکن
کیا یہ کم ہے کہ آپ کا ہوں میں

افسانہ

از

جناب ظفر قریشی بی۔ اے

پیدائش ۱۰ جون ۱۹۱۰ء، قدیم اور آبائی وطن دہلی، تعلیم بی اے (سینٹ سٹیفنز کالج۔ دہلی) تحریری کام کی ابتدا ۱۹۲۷ء سے کر رہا ہوں۔ اس وقت تک درجنوں روزانہ، ہفتہ وار اور ماہانہ جرائد میں کام کر چکا ہوں۔ آجکل مطبوعات متحدہ ہند دہلی میں طباعتی شعبہ میں کام کر رہا ہوں جب سے سرکاری ملازمت اختیار کی ہے۔ تحریری کام میں رخنہ پڑ گیا ہے۔ مگر جب احتیاج ستاتی ہے تو کام کرتا ہوں۔ ذاتی واقفیت کا حلقہ وسیع ہے۔ حالات سازگار ہوتے تو اپنی کتابیں خود چھاپتا اور "مڈل مین" کی دست برد سے بچ جاتا۔ شادی شدہ ہوں اور بے شمار بچوں کا "والدین" ہوں۔ مختصر افسانہ اور تاریخ کے مطالعہ سے دلچسپی ہے۔ ملنے کا پتہ ۳۰ راجپور روڈ دہلی ہے، عمر ۳۵ سال۔ صحت حد سے زیادہ اچھی۔ مزاج "ضرورت سے زیادہ عمدہ" اور قسمت بڑی بے ہودہ پائی ہے

(ظفر قریشی)

وہ ایک بے راہ رو نوجوان تھا۔ شکیل اور خود فراموش، گفتار میں جادو، عشرت کا دلدادہ۔ فطرت میں شاعری، دل و دماغ حساس اور قوت تسخیر بے پناہ، وہ بھونرے کی طرح کبھی اس کلی پر گرتا تھا، کبھی اس کلی پر۔ سچی محبت کا اس نے کبھی مزہ نہیں چکھا۔ جب کسی شائستہ محفل میں اس کا نام آتا تو لڑکیاں اس کے ذکر میں دلچسپی لینے لگتیں۔ لیکن اس کے قصے سنتیں تو دل نامعلوم خوف سے لرزش سی محسوس کرتا۔ اس کی ماں بیوہ تھی، خدا ترس، مالدار، ذی عزت، یہ اس کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اور اس کے بے جا ناز اٹھانا ماں کا کام تھا۔ یہ لڑکا اس کی زندگی کا آخری سہارا تھا۔ دونوں کوہ بلنی پر اپنی ذاتی املاک میں رہتے تھے۔

مگر آجکل ایک نئی ایکٹرس کے دام میں گرفتار تھا اور اس کے حسن کے حضور میں ماں کی دولت، اپنی صحت اور ورثہ میں پائی ہوئی چھوٹی موٹی عقل بطور خراج پیش کئے جا رہا تھا۔

انجام کار وہ اس ایکٹریس سے بھی دل برداشتہ ہو گیا۔

ایک رات جب شیشے کھنک رہے تھے اور نسوانی قہقہوں سے فضا میں سکر طاری تھا۔ اپنی تارا سے کہہ رہا تھا۔ "تم مجھے اس طرح کب تک پیار کرتی رہو گی؟ تمہیں معلوم ہے کہ میں نے کبھی کسی عورت کو دل سے نہیں چاہا۔ لیکن نہ جانے کیوں تمہاری طرف میرا دل خواہ مخواہ مائل ہی ہوتا چلا جا رہا ہے۔"

اس پر تارا نے ناز سے کہا۔ "لیکن میں نے بھی تو تمہاری دلجوئی میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی، میں نے تمہارے لئے کس کس چیز کو نہیں چھوڑ دیا۔ دنیا کی کون سی نعمت تھی جو حاصل نہ کر سکتی تھی۔ لیکن محض تمہاری خاطر سب کچھ ٹھکرا دیا۔ اب بھی اگر تم میری قدر نہ کرو تو تم حیوان ہو۔ لیکن یاد رکھو عورت جس قدر گہری محبت کر سکتی ہے، اتنی ہی شدید نفرت بھی کر سکتی ہے۔ مرد کو جب نفرت کا خراج ادا کرنا پڑتا ہے، تو وہ بہت گراں ہوتا ہے۔"

مگر کچھ چیں بہ جبیں ہو کر بولا "تو گویا تم مجھے دھمکا رہی ہو۔ مجھے زندگی کے انجام سے ڈراتی ہو۔ مگر میں اپنی فطرت سفاک کے ہاتھوں مجبور ہوں۔ میں ایک طفل بربادہ ہوں میری طبیعت بڑی ہرجائی ہے۔ میں چونکہ آجکل کنیز کی طرف مائل ہوں۔ اس لئے شاید تمہیں یہ ناگوار گزر رہا ہے، لیکن تم مجھے روک نہیں سکتیں۔ مجھے کسی پھولوں سے کوئی دلبستگی نہیں رہتی۔ تازگی و شادابی میرا معیار پسندیدگی ہے۔ سنتا تارا!"

تارا نے تیوری پر بل ڈال کر کہا۔ "تو آخر اس مس کنیز میں ایسی

کیا خوبی ہے، جو تم میرا وجود نظر انداز کئے دے رہے ہو؟ قمر، تم مجھے بلبل اور پتنگ سمجھ کر کہاں کے ساتھ عشرتوں کے سراب میں گم ہو جانا چاہتے ہو، میں ایسا کبھی نہ ہونے دونگی ...... تم میرے ہو اور صرف میرے۔ اگر تم میرے ہو کر نہ رہے تو پھر کسی کے بھی ہو کر نہیں رہ سکتے۔"

قمر جل گیا۔ "ہاں بلیوں کی سی خاصیت ہوتی ہے تم عورتوں کی۔ بلی کی یہ خاصیت ہے کہ جب دودھ پی نہیں سکتی تو اسے لڑھکا ضرور دیتی ہے"

تارا نے بپھر کر کہا۔ "تم کو بہت جلد معلوم ہو جائیگا۔ تم ہنس رہے ہو، تمہارے غرور کا یہ قہقہہ ساری عمر کے سرد سانسوں میں بدل دونگی"۔

قمر اسے بہت روکتا رہا، لیکن... ساپنین ایکٹریس بل کھاتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔

تارا نے انتقام لیا۔ رٹز تھیٹر سے ایک دن قمر اور کنیز نکل کر اپنی گاڑی میں سوار ہو رہے تھے۔ کہ ان پر کسی عورت نے برقع میں سے ہاتھ نکال کر تیزاب کی بوتل پھینک دی، اور اس کے بعد یہ برقع پوش ہنگامے میں غائب ہو گئی۔ چیخ پکار مچی۔ سب کچھ ہوا۔ لیکن پردہ نشین عورت کا سراغ نہ لگا۔ دوسرے دن اخباروں میں یہ خبر چھپی کہ مراد آباد کے مشہور تاجر ظروف مرزا قمر علی پر کسی نے، غالباً کسی عورت نے، جسے گرفتار نہیں کیا جا سکا، سینما سے نکلتے ہوئے تیزاب پھینک دیا۔ قمر علی صاحب کا چہرہ بالکل جھلس گیا ہے۔

(۲)

قمر تین مہینے تک ہسپتال میں پڑا رہا۔ جب باہر آیا۔ تو چہرہ اُدھڑے ہوئے سیمنٹ کے پلستر کی طرح بھدا اور زخمی ہو چکا تھا۔ آنکھیں، اندھے کنوئیں کی طرح بے نور تھیں۔

ماں کو اس بات کا بے حد صدمہ تھا، ایک دن وہ اُسے سمجھانے لگی۔ "بیٹا، تم اس قدر پریشان کیوں ہو۔ اتنا رنج کرنے سے اب حاصل بھی کیا ہے۔ اس رونے دھونے سے اب ہو گا بھی کیا۔ کاش تم پہلے ہی سنبھل گئے ہوتے ______"

قمر نے سرد آہ بھر کر جواب دیا۔ "ماں، میں کیا کروں۔ یہ زندگی یہ بے نور زندگی میرے لئے اب کس کام کی ہے، میں آنکھوں کے بغیر ایک لمحے کے لئے زندہ نہیں رہنا چاہتا۔ یہ چہرہ ______ اُف! ۔ ڈاکٹر کہتا تھا۔ کہ میرا چہرہ قیمہ قیمہ ہو گیا ہے۔ بالکل فرینکلٹین ہو گیا ہوں میری زندگی اب ایک چٹیل میدان کے سوا کیا ہے۔ اب کوئی میری طرف کیوں دیکھے گا۔ میں اس خیال ہی سے کانپ اُٹھتا ہوں۔ کہ اب کوئی میرے چہرے کی طرف دیکھنے کا روادار نہ ہو گا۔ میری آنکھیں نہ خود کسی نظارے سے مسرور ہو سکیں گی، نہ میرا چہرہ کسی کے دل میں کوئی لہر پیدا کر سکے گا۔ یہ جیتے جی کی مدت ہے۔ ماں آپ کو میں کیونکر سمجھاؤں، یہ جہنمی بے چارگی کیسی ہے۔ ماں ______"

قمر سسکیاں لینے لگا۔ ماں کا دل بھر آیا۔ "نہیں نہیں۔ قمر، تم بچوں کی طرح بیقرار نہ ہو۔ تم دل برداشتہ کیوں ہوتے ہو۔ ڈاکٹر نے غلط کہا۔ چہرہ جیسے پہلے تھا۔ ویسا ہی اب ہے۔ تمہاری آنکھوں میں بصارت نہیں رہی۔ لیکن میری آنکھوں کا نور تو کسی نے نہیں چھین لیا۔ اور آنکھیں؟ آنکھیں تو بالکل ٹھیک ہو جائیں گی۔ بمبئی چلو۔ وہاں ڈاکٹر بھابا سے علاج کرائیں گے۔ تیری ماں تجھ پر اپنا سب کچھ نثار کر دے گی۔ بیٹا تو پریشان نہ ہو"۔

قمر نے اپنے چہرے پر تاسف سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "ماں، آپ یہ سب باتیں اس لئے کہہ رہی ہیں کہ میری ماں ہیں۔ صرف میرا دل رکھنے کے لئے۔ ماں کے سوا کوئی اور عورت مجھے دیکھ کر یہ کہہ دے کہ یہ وہی قمر ہے۔ جب جانوں ______ ماں معاف کرنا، میں جوش میں بہت ہی بیہودہ ہو گیا ہوں! ______ بیشک ماں، میں خوب جانتا ہوں کہ محبت کی خواہ وہ کیسی ہی شکل ہو۔ لیکن مجھے حقیقی طور پر اگر ملی ہے تو ماں، آپ سے! مجھے اب اور محبتوں سے محرومی کا گلہ نہیں رہا ______ ہاں ماں، مجھے خوب یاد آیا۔ میری ننھی پھوسی کا کیا حال ہے، اس کے لئے دودھ آج آیا ہے یا نہیں ______؟ بہت پیاری بلی ہے۔ وہ مجھ سے بڑی مانوس ہو گئی ہے۔ اسے ذرا میرے پاس بھیج دیجئے، میں اس کے نرم بالوں پر ہاتھ پھیرونگا، آپ نے دیکھا ہے، کہ وہ کیونکر پیار سے آ کر میرے قدموں میں لوٹ جاتی ہے ______"

قمر بلی سے کھیلنے لگا، وہ تنہائی کی تنہا رفیق تھی۔ پاگلوں کی طرح اسے مخاطب کرتے کرتے وہ تھک گیا تھا، لیکن زندگی کا راستہ طے ہونے ہی نہیں پاتا تھا۔

"تو بھی ایک بلی ہے اور تارا بھی ایک بلی تھی۔ بس یہی فرق تو ہے۔ ایسا ہی دبلا پتلا جسم۔ تیری ہی جیسی کنجی آنکھیں۔ بھورے بھورے

سے بال، نرم نرم ہاتھوں میں انتقام کے تیز تیز ناخن چھپے ہوئے۔ اُس نے میرے چہرے کو تیزاب سے زخمی کر دیا۔ میری آنکھیں چھین لیں کہ پھوٹی سی کو پیار کی نظروں سے دیکھ سکوں، کوئی میرا چہرہ اگر دیکھے تو پھر دیکھنے کی ہوس نہ ہو۔ اور میں اگر کسی چہرے پر نظر ڈالنی چاہوں، تو یہ خواہش نہ کر سکوں آہ! یہ بھی کوئی زندگی ہے"۔

بلّی خُر خُر کئے جا رہی تھی۔ کبھی کبھی "میاؤں میاؤں" سے کچھ جواب دے دیا کرتی تھی۔ اس پر قمر کا جنون اور بڑھتا۔

"تو میرے قول کی تائید کرتی ہے، لیکن تیری وفا پر بھی کیا بھروسہ کر سکتا ہوں۔ کیا میں نے یہ نہیں دیکھا۔ کہ جب دودھ تیری دسترس سے باہر ہوتا ہے۔ تو تُو برتن کو لُڑھکا دیتی ہے۔ تجھے موقع ملا تو تُو بھی میرا چہرہ زخمی کئے بغیر نہ رہے گی، تُو نے پہلے قمر کو تو دیکھا تھا۔ کیسا طرحدار، کیسا شکیل اور سجیلا تھا۔ اچھا۔ اب تُو میرے پاس سے چلی جا۔ تیرا دودھ تجھے مل جائیگا۔ بلّیاں بس دودھ ہی تو چاہتی ہیں بس اور کیا۔ جا دور ہو!"

(۳)

ماں نے محسوس کیا کہ اس کے بیٹے کا دل تہذیب کی جلوہ سامانیوں سے نہیں بہل سکتا۔ وہ ایک خاموش مقام کی متلاشی رہی۔ جہاں قمر کی مجروح روح پر خاموش فطرت مرہم کا کام دے سکے۔ چنانچہ چند مہینے کی جستجو کے بعد اُسے ایک نسبتاً کم آباد ساحلی مقام پر لے گئی۔ گھر کا کام کرنے کے لئے ایک نوکرانی رکھ لی۔ اور ایک چھوٹے سے مکان میں جو کافی پُر فضا تھا۔ وہ رہنے لگی۔ ماں، بیٹے اور اس لڑکی کو جسے نوکرانی کا خطاب دیا گیا تھا، رہتے ہوئے چند روز ہوئے تھے۔ کہ ایک دن قمر نے ماں سے کہا۔

"ماں! مجھے اپنے ارد گرد کسی نوجوان لڑکی کی خوشبو اکثر محسوس ہوتی ہے کبھی کبھی آپ سے باتیں کرتے ہوئے دُور سے اُس کی آواز بھی سنائی دیتی ہے۔ کیا اس گھر میں کوئی لڑکی ہے ——؟ آپ کے سوا —— میرا مطلب ہے۔ ماں، یہاں کوئی اور عورت بھی رہتی ہے —— ؟ یا پاس کے بنگلہ سے یہاں کوئی آجاتا ہے، پڑوس کی وجہ سے"۔

"قمر نہیں معلوم ہے کہ ہم نے نوکر کے بغیر کبھی زندگی بسر نہیں کی ہیں یہاں بہت سے نوکرے سکتی تھی، لیکن صرف تنہائی میں رہنا مقصود ہے اس لئے خود ہی آئی، لیکن کام کاج خود نہ کر سکی۔ اس لئے میں پچھلے دنوں جب مہینہ کا سامان خریدنے بمبئی گئی۔ تو ایک گوآ کی رہنے والی لڑکی گھر کا کام کرنے کے لئے لے آئی تھی، لیکن میں اس کی موجودگی کو ظاہر کرنے سے ڈرتی تھی۔

قمر کو بعد میں معلوم ہو گیا۔ کہ اس لڑکی کو بھی دغا باز سمجھنا چاہیئے۔ وہ دوغلی ہے۔ گوآ کی دوغلی نسل سے ہے۔ آدھی یورپین یا ہالینڈی اور آدھی دیسی۔ آنکھیں اس کی بھی کرنجی ہیں۔ بال اس کے بھی بھورے ہیں۔ عمر اس کی بھی بیس بائیس سال کی ہے۔ ایک دن جب یہ تمام باتیں معلوم کر لیں تو قمر نے کہا: "ماں، مجھے بلّی جیسی عورتوں سے بچاؤ"۔ ماں ہنسنے لگی۔ "تم اُلّو ہو!"

لیکن وہ اُلّو نہ تھا۔ اور اسی وجہ سے اُس نے ایک اور انسانی بلّی کے پنجوں سے تکلیف اُٹھائی ——!

(۴)

ہولے ہولے قدموں کی آواز آ رہی تھی۔ قمر بنگلے کے سامنے گھاس پر بیٹھا تھا۔ ہولے ہولے قدموں کی آواز آ رہی تھی۔ ماں اسے روز یہاں چھوڑ جاتی تھی۔ اور دو گھنٹے کے بعد اسے سہارا دے کر یہاں سے اُٹھا لے جاتی تھی۔ ہولے ہولے قدموں کی آواز آ رہی تھی۔ یہ ماریا تھی۔ اس کا یہی نام تھا۔

قدم یکایک رک گئے "معاف کیجئے گا۔ میں آپ کی تنہائی میں مخل ہوئی"۔

"جی نہیں۔ جی نہیں"۔ قمر گھبرا سا گیا۔ "غالباً میں آپ کی آسائش میں مخل ہوا، آپ یہاں تنہائی سمجھ کر آئی ہوں گی۔ اور میں یہاں بیٹھا ہوں"۔

"جی نہیں ——"

"تو پھر آپ کو میرا چہرہ دیکھ کر ناگواری سی محسوس ہو رہی ہو گی"۔

"نہیں نہیں۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں، چہرے پر چند داغ پڑ جانے سے ایسی کوئی خاص بدنمائی نہیں پیدا ہوتی۔ کہ آدمی سے تمام انسان

نفرت کرنے لگیں" ــــــــ وہ خوب بڑھائی گئی تھی۔ اس لئے قمر کو خوش کرنے کے لئے وہ فقرے تول تول کر بول رہی تھی۔

"لیکن اگر میں یہ پٹی آنکھوں پر سے کھول دوں تو میرا چہرہ کٹر کھائی لاش کی مانند نہیں معلوم ہوگا، جب تو تم ضرور ڈر کر بھاگ جاؤ گی، تم مارا ہونا"

مارا نے مصنوعی شرم سے کہا۔ "جی ہاں، آپ سے بات چیت کرنے کا موقع ہی نہیں ملا میں آپ کو اسی حالت میں جیسا کہ آپ نے ابھی ذکر کیا، پہلے بھی دیکھ چکی ہوں لیکن میں ڈری وری نہیں"۔

"تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یا تو آپ سفاک بہت ہیں یا رحمدل حد سے زیادہ ہیں" قمر نے دلچسپی کا اظہار شروع کر دیا۔

"تعجب ہے رحم کی کر آپ میرے پاس آگئیں"؟

"رحم وہم تو مجھے کچھ نہیں آیا۔ مسٹر قمر، ہاں ویسے ہی میرا جی چاہا۔ اور ادھر ٹہلتی ہوئی نکل آئی۔ اچھا۔ اب میں جاؤنگی۔ بہت دیر ہو گئی ہے، ماں جی اب میرا انتظار کر رہی ہونگی، کھانا میز پر لگانا باقی ہے، آدمی تو کچھ زیادہ نہیں، لیکن یہاں پابندی بہت سخت ہے"۔

اس کے بعد وہ گھاس کے ٹکڑے پر اکثر ملتے رہے۔

ایک دن کی سرگوشیاں سُنیئے!

"مارا!"

"جی صاحب"۔

"تم میرے قریب کیوں نہیں سرک آتیں، میں تمہاری خوشبو سونگھنا چاہتا ہوں۔ اگر دیکھ نہ سکوں تو کیا چھو کر بھی نہ جان سکوں کہ تم کیسی ہو؟"

"جانے دیجئے ان باتوں کو، ایسی باتوں کا ذکر نہ کیجئے۔ ماں جی کہہ رہی تھیں۔ کہ اب تم پہلے سے اچھے ہو"۔

"جھوٹی ہو"۔

"نہیں۔ میں سچ کہہ رہی ہوں۔ کل ہی ماں جی مجھ سے کہہ رہی تھیں کہ بابا کے چہرے پر اب سخت رونق آگئی ہے۔! بابا اب روز ٹھیک ۸ بجے ناشتہ کر لیتا ہے۔ کھانا بھی پیٹ بھر کر کھاتا ہے۔ میں نے اُن سے کہا، ماں جی، میں نے تو صاحب کو اپنے کمرے میں کبھی کبھی گنگناتے ہوئے بھی سُنا ہے"۔

"اچھا، مارا۔ چھوڑو، ان قصوں کو۔ اب تم یہ بتاؤ۔ کہ یہ چھپ چھپ کر ملنے کی لعنت کب تک رہے گی؟

میں تمہیں کس شدت کے ساتھ چاہتا ہوں، یہ بتانے کے لئے میرے پاس ڈبڈباتی ہوئی آنکھیں نہیں ہیں، جو دکھا سکوں! میرا چہرہ ایسا نہیں رہا۔ کہ تم اس کے آئینے میں میرے دل کا عکس دیکھ سکو۔ نہ میرے لب ایسے رہے کہ ان کے گرم و پرخلوص بوسے کو تم محسوس کر سکو ــــــ اچھا اب تم جاؤ۔ میں آجکل میں ماں سے ایک بات کرونگا، چلو اب مجھے اندر پہنچا دو۔ تم شاید پھر میرے چہرے کی طرف دیکھنے لگیں، میرے چہرے کی طرف نہ دیکھا کرو۔ آج شاید چاندنی کھلی ہوئی ہے۔ میرے چہرے کی طرف خدا کے لئے نہ دیکھو ــــــ میں اسوقت کفن سے نکلا ہوا مردہ معلوم ہو رہا ہونگا ــــــ اوہ! مس مارا تم واقعی خوب صورت ہی ہو گی"۔

(۵)

اس دفعہ قمر کا عشق بے پناہ تھا، اور شاید صادق بھی۔ وہ سمجھتا تھا۔ کہ کفارہ ادا کرنے کے بعد اب اس کے لئے گناہوں کی راہ ختم ہو گئی ہے۔ اور وہ زندگی کے ایسے سنگ میل تک پہنچ چکا ہے۔ جہاں سے سکون حاصل کرنے کے لئے کسی مارا کی معطر چھاؤں میں رہنا ہی پڑیگا!

وہ سوچ رہا تھا کہ ماں سے کہے گا، میری اس لڑکی سے سول میرج کرا دو، یہ اہل کتاب عیسائی ہے کیتھولک، جیسے کہ تمام باشندگان گوآ ہیں۔ وہ سوچ رہا تھا کہ میں ماں سے کیا کیا کہونگا۔ وہ کہیگا، میں اب زیادہ طاقت جدائی اپنے آپ میں نہیں پاتا۔ میں اب زیادہ برداشت نہیں کر سکتا۔ کہ کوئی مجھے نہ چاہے۔

لیکن وہ یہ بھول گیا کہ مارا بھی تارا، کنیز اور ایسی ہی دوسری لڑکیوں کی طرح ایک دراز قد کرنجی آنکھوں والی لڑکی ہے!

ایک دن اُسے باغ میں بیٹھے بیٹھے بہت دیر ہو گئی۔ اور مارا نہ آئی۔ وہ پریشان ہو کر اپنی جگہ سے اُٹھ بیٹھا، اور سہارا لیتا ہوا۔ گھر کی طرف چلا۔ برآمدے کے باہر کی جافری سے اس نے کان لگا کر سُنا۔ مارا اور اس کی ماں میں کچھ تکرار ہو رہی تھی۔ مارا اس کی ماں کو جھڑک رہی تھی۔ یہ نہ معلوم ہوتا

تھا۔کہ وہ اس کی نوکرانی ہے۔بلکہ مالکہ معلوم ہوتی تھی۔

قمر کی ماں کہہ رہی تھی ——— "مارا، خدا کے لئے تم ایک مہینہ اور رہ جاؤ۔تم ابھی ہرگز نہیں جا سکتیں۔میں ابھی نہیں جانے دوں گی۔بھلا یہ بھی کوئی بات ہے۔کم از کم مجھے اتنا وقت تو دو۔کہ اس صدمہ کی برداشت کے لئے میں اسے تیار کر سکوں، یہ حد درجہ بے رحمی ہے۔میں نے سب کچھ جانتے ہوئے اُسے ایک طرح کے فریب میں مبتلا کیا تھا، اگر یہ فریب ٹوٹ گیا۔تو اس کی زندگی اور بھی برباد ہو جائے گی۔وہ اپنے آپ کو بالکل ہی تباہ کر لے گا کس قدر ظلم ہوگا۔وہ تمہیں واقعی دل وجان سے پیار کرتا ہے۔تمہارے بغیر وہ شاید زندہ بھی نہ رہ سکے۔کیا تم ماں کو سمجھ سکتی ہو ——— ؟ اگر سمجھو تو سوچو کہ اپنے اکلوتے بیٹے کے لئے ایک مال دار بیوہ کیا نہیں کر سکتی - تمہیں اور کیا چاہئے۔روپیہ نا۔روپیہ جس قدر چاہو۔میرا مطلب ہے اپنی ضرورتوں کے لئے جتنا چاہو۔لے جاؤ۔میں اپنے قمر کے لئے روپے کی کوئی قیمت نہیں سمجھتی۔

تم یہاں ابھی چند روز ٹھہرو ......"

لیکن مارا اپنی اہمیت کو پہچان گئی تھی، اس لئے ناز برداری کرا رہی تھی۔

"نہیں ماں جی۔میں کچھ نہیں چاہتی۔آپ مجھے کسی طرح کا لالچ نہیں دے سکتیں میں قمر کو بھی کسی محبت کا مستحق نہیں سمجھتی، نہ میں اب اس کا دل بہلا سکتی ہوں۔نہ وہ میرا کوئی ہے۔زیادہ سے زیادہ تم مجھے کچھ اور روپے دے دو گی۔لیکن محبت کی قیمت روپیہ نہیں! محبت دولت سے نہیں خریدی جا سکتی!!"

ماں نے اب اپنا دل اس کے سامنے کھولنا شروع کیا۔"کمبخت! تو بدنصیب ہے، میں تو یہاں تک سوچ رہی تھی۔کہ تجھے ہمیشہ کے لئے اس سے وابستہ کر دوں۔سوچ تو کتنی سخت غلطی کر رہی ہے، میرا قمر اب بالکل بدل چکا ہے میں اسے خوب جانتی ہوں۔آخر اس کی ماں ہوں"۔

لیکن مارا کو کون مجبور کر سکتا تھا۔

"نہیں آپ زیادہ زور نہ ڈالئے میں اور نہیں ٹھہر سکتی۔میں جاؤنگی۔میرا حساب کر دیجئے۔میں کرائے کی عورت سہی، لیکن آخر دل تو میرا بھی ہے۔میں اس کے سڑاندے بو سے کب تک سہے جاؤں۔برداشت کی بھی تو آخر ایک حد ہوتی ہے۔مجھے وہ روز رات کو تنگ کرتا ہے ——— اس کا چہرہ، اُف کتنا خوفناک ہے ——— ماں تم عورت ہو کر دیکھو، ماں بنکر مت سمجھو قمر کو!

قمر کی ماں کا سینہ شق ہوا جا رہا تھا۔وہ اسے قمر کا دل بہلانے کیلئے لائی تھی۔لیکن وہ تو کچھ اور ہی نکلی۔

"میں تجھے گندے غار سے نکال کر لائی تھی۔تاکہ تو اس کی مرجھائی ہوئی زندگی میں آکر ایک لہلہاتا ہوا باغ کھلا دے۔خود بھی ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھے گی اور اسے بھی سکھ پہنچائے گی، لیکن تو تو ناگن ہے ناگن۔مارا۔اس کا دل ٹوٹ جائیگا۔تجھے اتنی بڑی اُجرت دیکر میں لائی کس لئے تھی۔کیا اس لئے کہ تو میرے بیٹے کا دل توڑ کر لے جائے، میں قمر کو بچانے کے لئے اس ذلت تک اُتر آئی تھی، محض ایک بچے کے لئے، اسے مایوسی اور خودکشی کے بھیانک شعلوں سے بچانے کے لئے ——— مارا ——— مارا۔خدا کے لئے ہم دونوں پر رحم کر۔اُس مقام پر آکر دیکھ جہاں ایک عورت ماں ہو کر پہنچتی ہے - اور پھر سوچ کہ میں ایسا سلوک کر سکتی ہوں کیا ——— نہیں - مارا تم کچھ دن اور ٹھہرو ——— !"

لیکن میں صاحب کی طرف دیکھتی ہوں۔تو متلی ہونے لگتی ہے، وہ جب مجھے اپنی طرف کھینچتا ہے۔تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی قبرستان میں مُردے سے کُشتی لڑ رہی ہوں۔آخر یہ گھناؤنی باتیں کب تک سہے جاؤں"۔

"نہیں مارا، تمہیں تو یہ کرنا ہی ہوگا - خدا کیلئے تھوڑے دن اور ٹھہرو، میں یہ ہیروں کا بروچ تمہیں دے دوں گی - اصلی ہیروں کا ہے"۔

"کیا یہ اصلی ہیرے ہیں؟"

"ہاں بالکل"۔

"اچھا تو میں سوچ کر جواب دونگی!"

قمر یہ سب کچھ سُن رہا تھا۔سُن کر وہ سیدھا اپنے کمرے میں گیا۔مارا اس کا دودھ گرم کر کے پیالہ لیکر حسب معمول پہنچی۔لیکن کمرے میں اندھیرا تھا۔

"صاحب، آج مجھے بہت دیر ہو گئی۔میں دودھ گرم کر کے ابھی لا رہی ہوں۔مجھے آپ کا بہت خیال رہتا ہے۔اگر میں ہی خیال

نہ رکھوں تو اور کون رکھے گا۔"

یہ کہتی ہوئی وہ دروازے میں داخل ہوئی، لیکن وہاں ایک قمر تھا خون میں لتھڑا ہوا۔ جلدی سے ایک لالٹین لائی گئی۔ بجلی کا تار لٹکا ہوا تھا۔ کمرے میں بالکل اندھیرا تھا۔ ماں چیخ مار کر بیٹے کی لاش پر گر پڑی۔

ماں اپنے بیٹے کے لئے رو رہی تھی، اور بازار کی کرائے پر چلنے والی عورت سامنے لگے ہوئے قدِ آدم آئینے میں اپنے جسم کی موزونیت کا اندازہ کر رہی تھی۔ اس کے لمبے لمبے بھورے بالوں پر لالٹین کی مدھم روشنی پڑ رہی تھی

قمر کی آنکھیں، بے نور آنکھیں مارا کی کرنجی آنکھوں کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ نہ پہلے کچھ دیکھ سکتی تھیں نہ اب۔

"ارے یہ کیا ؟ خون کے دھبے"! مُردے نے میری تمام ساڑی ناس کردی"! مارا کے منہ سے نکلا۔

بلی میاؤں میاؤں کرتی ہوئی کمرہ سے باہر نکل گئی۔ اس کے بال بہت نرم، قد لمبا اور آنکھیں کرنجی تھیں، جیسی تاراؔ۔ کنیز اور ماراؔ کی تھیں ؎

آج کل

ایک کامیاب محبت عاشقِ صادق کے پاکیزہ جذبات کی سچی تصویر

از

حضرت علامہ ابو نعیم نشترؔ جالندھری

حاصل مجھے وہ عیشِ فراواں ہے آجکل
ہر خارِ دشت خلد بداماں ہے آج کل

جو گُل کدہ ازل سے کلی کو ترس گیا
رشکِ ہزار روضۂ رضواں ہے آج کل

جو لب نہ بھول کر بھی شراب آشنا ہوا
ہر لحظہ غرقِ بادۂ عرفاں ہے آج کل

اللہ تیری شان کہ پھر بوریا مرا
چشمک زنِ سریرِ سلیماںؑ ہے آج کل

غلمان و حور سرخوشِ رقص و سرود ہیں
میرا سیاہ خانہ پرستاں ہے آج کل

گھی کے چراغ جلتے ہیں دربارِ مصر میں
پھر شمعِ انجمن مہِ کنعاں ہے آج کل

اِک بے نوا کا اوجِ مقدر تو دیکھئے
پہلو نشینِ خسروِ خوباں ہے آج کل

وہ دن بھی تھے کہ منزلِ جاناں کی تھی تلاش
خود میرا گھر ہی منزلِ جاناں ہے آج کل

دنیا بہشت بن گئی نشترؔ مرے لئے
"جوشِ قدح سے بزم چراغاں" ہے آج کل

کیف و سرورِ نشۂ محبوب کچھ نہ پوچھ
بس مختصر یہ ہے کہ وہ مہماں ہے آجکل

طوائف

افسانہ

از

جناب اسحٰق ادیب رام نگری

میں مراد آباد جارہی تھی۔ میری شکل وصورت، پوشاک، وضع قطع اور بات چیت سے کوئی نہ سمجھ سکتا تھا کہ میں طوائف ہوں، بس تو کیا آج کل کی ساری طوائفیں اپنے آپ کو کالج گرلز کے سانچے میں ڈھال کر رکھنے کی کوشش کرتی ہیں، یا یوں کہئے کہ آجکل کی کالج گرل اور طوائف میں ظاہری طور پر بہت کم فرق نظر آتا ہے۔ کیونکہ اس ٹٹی کی آڑ سے صحرائے رومان کے آوارہ گرد آہوؤں کا شکار آسانی اور خوبصورتی سے ہوتا ہے۔ جس طرح جنگلی ہرن شکاری پوشاک میں کسی شہری کو دور ہی سے دیکھ کر چوکنا ہوجاتا ہے، لیکن دیہاتی کسانوں کے شور وغل کرنے پر بھی کھیت سے منہ نہیں اُٹھاتا۔

میں زنانہ انٹر کلاس میں بیٹھی تھی۔ سامان وغیرہ قاعدے سے رکھوانے کے بعد رونق علی میرے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ بغل کے ڈبے میں جا بیٹھا تھا۔ اور بڑے بڑے سٹیشنوں اور جنکشنوں پر آکر ضرورت کی چیزوں کا انتظام کرجایا کرتا تھا۔

آج رونق علی میرے یہاں نوکر کی حیثیت سے رہتا ہے۔ اور میری ضروریات کو مجھ سے زیادہ سمجھتا اور خیال رکھتا ہے۔ ایک زمانہ تھا۔ جب میں کچھ ناسازگار حالات کے زیر اثر اپنا گھر چھوڑ کر اس کے ساتھ بمبئی بھاگ گئی تھی اور اس کی دولت کے بل پر وہاں کے سب سے بڑے ہوٹل میں ٹھہری تھی جس کا شاندار اور مرصع کمرہ اب بھی اکثر میری نگاہوں میں پھر تار ہتا ہے اور کبھی کبھی وہ پارک یاد آجاتا ہے۔ جہاں ہم دونوں کمر اور گلے میں باہیں ڈالے سنہری شام کا لطف اُٹھایا کرتے تھے۔ وہ سینما ہال اور تھیٹر اب بھی موجود ہیں۔ جہاں رونق علی میرے ساتھ سیکڑوں روپے روزانہ خرچ کر دیتا تھا۔ سب کچھ وہی ہے۔ رونق علی بھی ویسا ہی ہے۔ اس کا دل بھی وہی ہے، صرف اس کے پاس اب ایک چیز نہیں۔ وہی دولت جس نے اُس وقت مجھے اس کی لونڈی بنا رکھا تھا۔ آج اس سے بچھڑ بچھڑ کر میں اس کی مالکہ بن گئی ہوں۔

اُس وقت وہ میری محبت یا اپنی نفسانیت سے جو بھی کہئے اندھا ہو رہا تھا، وہ میرا حسن اور جوانی خرید رہا تھا۔ اور میں اس کی دولت دونوں ہاتھوں سے سمیٹ رہی تھی۔

تھوڑے ہی دنوں میں معلوم ہؤا کہ میرا سودا جوں کا توں ہے۔ لیکن رونق علی کی دولت ختم ہوگئی۔ اور چونکہ میں اس تجارت کی عادی ہوگئی تھی۔ اس لئے دوسرے گاہکوں کی تلاش میں مصروف ہوگئی۔

سودا کھرا ہو تو گاہکوں کی کمی نہیں ہوتی۔ خریداروں کی فرمائش پر میں نے اپنے حسن کی دکان سجانے کے لئے رقص ونغمہ کی تعلیم کے حصول کی بھی کوشش کی۔ اور اپنی فطری ذہانت سے اس میں بھی جلد ہی کامیاب ہوگئی۔ جس سے گاہکوں کی تعداد میں دن دُگنی اور رات چوگنی ترقی ہونے لگی۔ میں نے اپنا اصلی نام بھی بدل ڈالا۔

لیکن اب بھی جب رونق علی میرے پرانے نام فیروزہ سے پکار بیٹھتا ہے، تو میرے سازِ تخیل کے تاروں میں ایک جھنکار سی پیدا ہوجاتی ہے۔ اور ماضی کا بھولا ہؤا نغمہ میرے کانوں میں گونج اُٹھتا ہے۔ اور ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی دور سے پکار کر کہہ رہا ہو۔ کہ "فیروزہ اب بھی وقت ہے، اپنی جگہ لوٹ آ"۔ لیکن اب میں عیش وعشرت کی ایسی گہری کھائی میں گر چکی ہوں کہ وہ آواز میرے کانوں تک پہنچتے پہنچتے رہ جاتی ہے۔

ایک جنکشن پر گاڑی رُکتے ہی سب کھڑکیوں اور دروازوں سے بستروں۔ سوٹ کیسوں۔ گٹھڑیوں اور آدمیوں کی بھرمار شروع ہوگئی۔ اسی بھاگ دوڑ میں میری نگاہ پلیٹ فارم پر ایک برقع پوش عورت پر پڑگئی اس کے ساتھ ایک مرد تھا۔ جس کی گھبرائی ہوئی نگاہیں ہر ڈبے پر لفظ "زنانہ"

پڑھنے کی کوشش کرتی معلوم ہو رہی تھیں۔ میرے ڈبے پر نگاہ پڑتے ہی جیسے اُسے کچھ ڈھارس سی بندھی۔ اور اپنے ساتھ کی عورت کو کچھ اشارہ کرتے ہوئے ساتھ لے کر تیزی سے میری طرف بڑھا۔ عورت کی گود میں ننھا سا بچہ بھی تھا۔ مجھ سے اُس کی پریشانی دیکھی نہ گئی۔ اور خود تنگی سے بیٹھنے کے باوجود میں نے اپنی بغل میں جگہ دیدی۔ "تمہارے بھائی کہاں گئے؟" عورت نے بیٹھتے ہوئے اپنے ساتھی سے سوال کیا۔

"وہ دوسرے ڈبے میں اپنے لئے جگہ تلاش کر رہے ہیں ـــــ!"

اس نے جواب دیا۔

اتنے میں سیٹی ہوئی اور گاڑی چل پڑی۔ شاید وہ ان دونوں کو صرف گاڑی میں بٹھانے ہی آیا تھا۔ اُس کے اوجھل ہوتے ہی بچہ اس کے پاس جانے کے لئے مچلنے لگا۔ اُس کی ماں ہر طرح تھک گئی۔ تو میں نے اُسے اپنی گود میں لے لیا اور ٹوکری سے مٹھائی نکال کر اُسے بہلانے کی کوشش کرنے لگی۔

عورت نے میری ہمدردیوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا ـــــ

"وہ اس کے چچا تھے۔ حال ہی میں ولایت سے تعلیم حاصل کر کے عرصے کے بعد واپس آئے ہیں۔ اسے بہت پیار کرتے ہیں۔ اس لئے یہ بھی اپنے باپ سے زیادہ اُن سے مانوس ہو گیا ہے۔"

بچے کو تو میں پہلی ہی نگاہ میں پیار کرنے لگی تھی۔ اُس کی ماں کے منہ سے دیور کیلئے "آن" کا لفظ کچھ ایسی مٹھاس کے ساتھ نکلا تھا۔ اور بچے کے باپ کا ذکر کرتے ہوئے اس کے چہرے پر کچھ ایسا رنگ دوڑ گیا تھا کہ میرے اندر جیسے کوئی چھپی ہوئی فطری خواہش کروٹیں لینے لگی۔ اور جیسے میرا دل دیور، شوہر اور کسی ماں کہنے والے کیلئے مچل اُٹھا۔

گفتگو کے سلسلے میں معلوم ہوا۔ کہ اُس کا نام سلطانہ ہے۔ وہ بھی مراد آباد اسی شادی میں شرکت کیلئے جا رہی ہے جس میں میں بلائی گئی تھی۔ اس کی باتوں سے ظاہر ہوا۔ کہ وہ اپنے شوہر کی دوسری بیوی ہے پھر بھی ان کے ساتھ بہت خوش اور مطمئن ہے۔ کیونکہ وہ اس کا ہر طرح خیال رکھتے ہیں۔ ہر آن جان چھڑکتے ہیں۔ اسے اس پر ناز ہے کہ اس کے شوہر اسے بہت پیار کرتے ہیں۔

مجھے سلطانہ کے بھولے پن پر ہنسی بھی آئی اور اپنی صنف کی اس ذہنیت پر غصہ بھی آیا۔ اس لئے چڑ کر بولی۔ "یہ بے چاری بیوی نام کی سادہ لوح مخلوق خود غرض مرد کی غلامی کا طوق گلے میں ڈال کر ہر لمحہ اسکے اشاروں پر ناچنے اور لونڈی کی طرح چوبیس گھنٹے خدمت کرنے کے عوض میں اس سے بناوٹی ہمدردی کے چند لفظ سنکر اور خادمہ کی طرح دو روٹی اور سال میں کچھ کپڑے پاکر اپنے آپ کو کس قدر خوش قسمت سمجھنے لگتی ہے۔ اس کے احساسات اور جذبات مرد کی تنگ ذہنیت کے ہتھیاروں سے ذبح ہو جاتے ہیں۔ اور وہ اینٹوں اور پتھروں کی چار دیواری میں گھٹ گھٹ کر دم توڑ دیتی ہے، وہ عورت کا صحیح مقام پہچان ہی نہیں پاتی۔ وہ اس بھکاری لڑکے اور آج کے ہندوستانی کی طرح جسے یقین ہو گیا ہو۔ کہ میرے آباؤ اجداد سے بھیک مانگتا چلا آرہا ہے۔ اور میں تو غلامی ہی کرنے کیلئے پیدا ہوا ہوں۔ سمجھ بیٹھتی ہے کہ اس شوہر نام کے دیوتا کی پرستش ہی میں میری نجات ہے۔ لیکن جو عورت اس غلامی کی پھُس پھُسی زنجیروں کو جھٹک کر اپنے اصلی مقام پر آبیٹھتی ہے۔ اس کے قدموں میں مرد کا پُر غرور سر اس طرح سجدۂ نیاز ادا کرتا ہے۔ کہ اتنا عجز اپنے خالق کیلئے بھی پیدا نہیں کر سکتا۔ بلکہ اسے یکسر بھول بیٹھتا ہے۔ صرف سجدۂ نیاز ہی نہیں اس کی ایک نگاہِ التفات کیلئے اپنا سب کچھ بھینٹ کرنے کے بعد بھی اپنی کم مائیگی پر متاسف ہی رہتا ہے۔ عام مردوں کو تو چھوڑ دو، اپنے آپ کو بادشاہ کہلانے والا بھی اس کے حضور میں باریاب ہوتا ہے تو لڑکھڑاتے پاؤں اور نیچی نگاہوں کے ساتھ۔ میں بھی آج اسی تقریب میں جا رہی ہوں۔ جس میں تم جا رہی ہو۔ لیکن میری اور تمہاری حیثیت میں کنکر اور کوہِ نور کا فرق ہے۔ تم صرف دو پیسے کے پوسٹ کارڈ یا چھ پیسے کے لفافے کے بُلاوے میں بندھی چلی جا رہی ہو۔ مجھے ایک ہزار روزانہ کی پیشکش پر حاصل کیا جا سکا ہے۔ اس شادی کی ہماہمی اور ہنگامے میں کسی کو خبر بھی نہ ہو گی کہ اس چار دیواری کے اندر سلطانہ نام کی کوئی عورت بھی کسی کونے میں پڑی ہے۔ لیکن بمبئی والی ہیرابائی کا نام سنکر لوگ دور دور سے درشن کے لئے آئیں گے۔ اور جس کی طرف ایک نگاہ غلط انداز بھی اُٹھ جائیگی۔ وہ اپنی قسمت پر ناز کرے گا تمہاری تمام خدمتوں کے باوجود تمہاری چھوٹی چھوٹی فرمائشوں اور خواہشوں کا گلا گھونٹنے والے مرد میری ہر نگاہ پر روپے اور زیورات کی بھینٹ لیکر

درجہ قبولیت کی بھیک مانگنے آئیں گے اور ———"

میں اپنی دھن میں بولے جا رہی تھی کہ ایک مرتبہ میری نگاہ اپنی بغل میں بیٹھی ہوئی ایک عورت پر پڑ گئی جو میری طرف ایسی نفرت آمیز نگاہوں سے دیکھ رہی تھی، جیسے اسے متلی ہو رہی ہو اور کچھ اس طرح اپنے کپڑے سمیٹ کر بیٹھنے کی کوشش کر رہی تھی، جیسے میں کوئی ناپاک چیز ہوں۔ اور اس سے پہلے کہ میں سوال کروں، سلطانہ انتہائی حقارت آمیز انداز سے بولی۔ اوہ ——— تو تم طوائف ہو؟ ——— طوائف کی پست دنیا میں رہ کر تمہاری نگاہیں بیوی کی رفعت اور اس کے مقام کی بلندی تک پہنچ بھی کیونکر سکتی ہیں۔ جس طرح باطنی بصارت سے محروم آنکھیں ذرے ذرے سے جھلکنے والے خدا کو دیکھنے سے محروم ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح ایک اتھاہ اور تاریک غار میں گرے ہوئے انسان کو چودھویں کا چاند اگر دھندلا اور ٹمٹماتے ہوئے ستارے کی طرح نظر آئے، تو کیا تعجب ہے۔

"تمہیں اس بات پر ناز ہے کہ لوگ تمہاری قیمت زیادہ سے زیادہ لگاتے ہیں، لیکن میں نہیں سمجھ سکی کہ اگر کوئی ضرورتمند گندگی اور سڑی گلی چیزوں کی کھاد پیسہ دے کر خرید لے تو اس کی گندگی اور غلاظت میں کیا فرق آ سکتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ تمہارے قدموں پر روپے پیسوں کی تھیلیوں اور بیش قیمت تحائف کے ڈھیر لگے رہتے ہیں، لیکن کیا کبھی تم نے یہ بھی سوچا کہ ان کے عوض تمہیں بیچنا کیا کیا پڑتا ہے؟ وہ پاک مسکراہٹیں جو خالق کائنات نے جنت کے مقدس پھولوں کے تبسم سے نچوڑ کر عورت ذات کو ودیعت کی تھیں، چند سکوں کے عوض ہر شرابی، جواری، بدقماش اور ننگ انسانیت کے قدموں کے نیچے بچھانی پڑتی ہوں گی۔ وہ عصمت جو حوروں کی پاک دامنی سے مستعار لے کر بطور امانت عورت کے دامن میں رکھی گئی تھی، اسے تم ہر آنے جانے والے کے راستے میں بکھیرتی پھرتی ہو گی، حیا و شرم کا وہ تحفہ جسے ایک بیوی کہی جانے والی گھونگھٹ سے ڈھک کر اپنے شوہر کے سامنے پیش کرتے ہوئے بھی جھجک محسوس کرتی ہے، تم اسے جذبات اور بے غیرتی کے تھال میں سجا کر ہر اجنبی کے سامنے بے دریغ رکھ دیتی ہو گی ——— تم سمجھتی ہو کہ تم نے عورت کا صحیح مقام حاصل کر لیا ہے، لیکن ذرا سوچو تو کونسا مقام اس کے شایان شان ہے؟ بہتر کیا ہے؟ ایک ایسے پجاری کی پاک اور بے غرض پوجا جو ہماری ہر خدمت کیلئے اپنا خون پسینہ ایک کرتا ہے، جو اپنا دکھ سکھ بھول کر ہمارے لئے زمانہ بھر کی ٹھوکریں کھاتا پھرتا ہے، جو گردش دوراں اور حوادث روزگار کے تھپیڑے اپنی باتھوں پر روک کے کھڑا رہتا ہے۔ لیکن ہمیں ہمارے مقام کی بلندی سے ایک انچ نیچے کھسکتے نہیں دیکھ سکتا۔ یا وہ بھوکے کتے جو چند سکوں کے عوض تمہاری ہڈیوں تک کو چچوڑ ڈالتے ہیں جو اپنی جذبات کی ٹھوکروں پر تمہاری عفت و عصمت اور شرم و حیا کو سر راہ اچھالتے پھرتے ہیں، ذرا سوچو، کون بدترین غلام ہے؟ ہم بیویاں کہی جانے والی۔ یا تم جیسی ننگ نسائیت! جو صرف چند حقیر سکوں کے لئے اپنے آپ کو درندہ صفت انسان نما شیطانوں کے گندے جذبات کی غلامی کی زنجیروں میں جکڑے پھرتی ہیں ——— ؟ لیکن تم کر بھی کیا ——— ؟ تم سمجھ بھی کیونکر سکتی ہو؟ تم نے اپنی نسائیت کا گلہ زر پرستی اور جذبات پرستی کے ہاتھوں ایسی بری طرح گھونٹ رکھا ہے کہ اس کی بیٹھی ہوئی آواز اور گھٹی ہوئی کراہ خود تمہارے کانوں تک نہیں پہنچ سکتی ——— ہو سکتا ہے کہ میری باتیں تمہاری سمجھ میں نہ آتی ہوں۔ کیونکہ تم نے آنکھ ہی اس پر معصیت ماحول میں کھولی ہے جہاں کی مسموم ہوا نے تمہارے دل اور دماغ میں سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت ہی پیدا نہ ہونے دی ہو گی!"

سلطانہ کے اس جملے نے میرے پردۂ تخیل پر ایسی ٹھیس لگائی کہ میرا کراہ اٹھا۔ اس کا ہاتھ انجانے ہی میں میری ایسی دکھتی ہوئی رگ پر پڑ گیا کہ کوشش کے باوجود آنسو رک نہ سکے، اور میں بے اختیار بول پڑی "کرو بہن! تم نے مجھے اس قدر جھنجھوڑا ہے کہ برسوں کا بھولا ہوا خواب آنکھوں میں پھر گیا۔ تمہیں یہ کیونکر معلوم ہوا کہ میں نے آنکھ ہی اس گندے ماحول میں کھولی ہے؟ اس میں شک نہیں کہ آج اس غلاظت میں لت ہو کر میری نسائیت کا وہ جوہر دھندلا پڑ چکا ہے، جس کی جوت سے تمہارا دل جگمگا رہا ہے۔ لیکن زیادہ دنوں کی بات نہیں جب میں بھی تمہاری طرح کسی کے من کی رانی اور گھر کی ملکہ تھی، تمہاری ہی طرح کسی کی نور کسی کی آنکھوں کا نور اور دل کا سرور اور اس کے میٹھے سپنوں کی رانی لیکن اچانک میرے سکھ سنسار میں ایک ایسی ہولناک آندھی آئی کہ سب کچھ اڑا کر کسی اور خوش نصیب کے آنگن میں پھینک آئی، اور میرے لئے چھوڑ گئی صرف تنہا راتیں اور بھولنے والے کی یاد میں جپنے کے لئے آنسوؤں کی مالا۔ امنگوں بھرا دل، اور اداس راتیں، یہ بے جوڑ اور غیر فطری

ناقابل برداشت تو ہو ہی رہی تھی، میرے حسن اور جوانی نے ایک دوسرے بچاری
اپنی طرف متوجہ کیا، اور پھر میرے ڈوبتے ہوئے جذبات بھی اس تنکے کا سہارا
بغیر نہ رہ سکے، تنکے ہی کا سہارا تو کب تک کام دیتا۔ میں لہروں کی لپیٹ
میں آگئی۔ اور آج اس اتھاہ اور ناپیدا کنار ساگر میں غوطے کھا کھا کر اتنی بے حس
ہو چکی ہوں کہ اب اُبھرنے کا خیال بھی نہیں آتا۔ کون جانے اُن کا کیا حال ہے
اور کہاں ہیں ——— ؟"

میں کھوئی ہوئی سی بوئے جا رہی تھی کہ ایک جھٹکے کے ساتھ گاڑی رُکی
اور کھڑکی سے آتی ہوئی کسی مردانہ آواز نے مجھے چونکا دیا۔ سلطانہ کے شوہر
قلی کو سامان اُتارنے کی ہدایتیں دے رہے تھے۔ اُن سے نگاہ ملتے ہی میرے
حواس معطل سے ہو گئے، ایک لمحہ ہماری آنکھیں ایک دوسرے کے چہرے
سے ہٹ نہ سکیں، پھر یکایک میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ ڈھانپ
لیا۔ سلطانہ ہم دونوں کو حیرت زدہ سی دیکھ رہی تھی۔ اور قریب تھا کہ اپنے
شوہر سے کچھ سوال کر بیٹھے کہ انہوں نے چونک کر گھبراہٹ کے انداز میں کہا

"جلد اُترو گاڑی چھوٹ رہی ہے"۔

دوسری طرف سے رونق علی بھی آ پہنچا۔ اور گھبرایا ہوا بولا "ارے باٸی جی ابھی آپ بیٹھی ہی ہیں ——— ؟"

"جلدی کی کوئی بات نہیں رونق علی!" میں نے بھاری آواز سے کہا۔ "اطمینان سے سامان اُتار کر پلیٹ فارم پر رکھ لو ——— !"

"لیکن مراد آباد کی گاڑی دوسرے پلیٹ فارم پر کھڑی ہے۔ اور چند ہی منٹ بعد چھوٹنے والی ہے ——— ؟" اُس کے منہ سے گھبراہٹ میں بات نہ نکلتی تھی۔

"چھوٹ جانے دو رونق علی ———!" میں نے اطمینان سے کہا اور اُتر کر پلیٹ فارم پر کھڑی ہی ہوئی تھی کہ مراد آباد کی گاڑی چل پڑی، اور جب میرے سامنے سے وہ ڈبہ گزرا جس میں سلطانہ اپنے شوہر کے کندھے پر ہاتھ رکھے بیٹھی تھی اور دونوں میری طرف دیکھ رہے تھے، تو میں لڑکھڑا کر پاس رکھے ہوئے ٹرنک کا سہارا لیکر زمین پر بیٹھ گئی ———

غزل

از جناب قمر ہاشمی ٹونکی

یہ کیا کہا کہ مجھے اب ستم کی تاب نہیں
تری نظر ہی میں وہ شوخیٔ عتاب نہیں

یہ اشکِ غم، یہ تباہی، یہ دل کی ناکامی
نگاہِ دوست کرم کا ترے حساب نہیں

ترے جمال سے رنگِ چمن کو کیا نسبت
بہارِ گل بھی باندازۂ شباب نہیں

جبیں پہ بل ہے لبوں پہ تبسم رنگیں
یہ ایک شوخیٔ معصوم ہے عتاب نہیں

ہزار ہوش و خرد کے جہان لوٹے ہیں
کسی کو تیری نگاہِ کرم کی تاب نہیں

مری نگاہ بنی خود ہی پردۂ حیرت
وہ بے نقاب بھی اب ہیں تو بے نقاب نہیں

گزر چکا ہوں قمر اب ہر ایک منزل سے
جگر میں سوز نہیں دل میں اضطراب نہیں

افسانہ

از

خطیبۂ ہند محترمہ سیدہ اختر صدر آل انڈیا زنانہ مسلم لیگ و مدیرہ ہفتہ وار "حرم" کانپور

آجکل ایڈیٹر اُس عجیب و غریب ہستی کا نام ہے، جسے اپنے ماحول کی قطعاً خبر نہ ہو، خامہ در دست محو جنبش۔ دماغ ٹائپ رائیٹر کی طرح گرم حرکت، اور نگاہ مثل برق۔ کچھ لکھنے میں معروف۔

خامہ سیاسیات حاضرہ پر ایڈیٹوریل، دوسرے موضوعات پر مختصر نوٹ، موصول شدہ مقالات کی اصلاح و ترمیم، منظومات کی قطع و برید، ضروری خطوط کے جوابات وغیرہ لکھنے میں محو۔ قصہ کوتاہ ——— یک سر و ہزار سودا ———

جب ہم عہد حاضر کے ایڈیٹروں کے حالات کا چشم تصور سے مشاہدہ کرتی ہوں تو ہمدردی کے بجائے اس غریب پر بے اختیار ہنسی آجاتی ہے جس ایڈیٹر کو دیکھیے اپنے آفس میں "اودھ پنچ" اخبار کا کارٹون بنا بیٹھا ہے، اور پھر لطف یہ کہ اُسے اپنے کارٹون بن جانے کی مطلق خبر ہے نہ احساس! اللہ رے صحافتی انہماک۔ یقین نہ ہو تو جناب سالک مدیر "روز نامہ انقلاب" سے پوچھ لیجیے!

ایڈیٹر کی میز کیا ہوتی ہے۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے بالکل کباڑی کی دوکان معلوم ہوتی ہے اُس پر ستم یہ کہ کسی کو یہ توفیق نہیں۔ بے خبر ایڈیٹر کی بجھی چلم پر "اصغر علی محمد علی" کا عطر پاش خمیرہ رکھ کر اُس پر چند دہکتے ہوئے انگارے رکھ دے، اور یہ نہیں تو کم از کم حیدر آباد کی چار مینار سگرٹ کا ایک پیکٹ ہی سبز بوسیدہ بانات کی میز پر جس پر جابجا سیاہی کے دھبے پڑے ہیں چپکے سے رکھ دے۔ تاکہ ایڈیٹر کا سست رفتار قلم موج رواں بن جائے۔ سبز بانات والی میز جس کے طول و عرض کی سطح بے شمار بے ترتیب فائل، منتشر کاغذات سے سجی ہے۔ اور جس کی درازوں میں پنسلیں، گوند کی شیشیاں لفافے، پیڈ، پان کا بٹوہ اور خدا جانے کیا الا بلا ——— "دریا بہ حباب اندر" ہے۔

جب غریب ایڈیٹر کا ہاتھ لکھتے لکھتے شل اور دماغ سوچتے سوچتے بوجھل ہو جاتا ہے تو یہ تھکا ماندہ ایڈیٹر کچھ دیر کے لئے کرسی پر خواب راحت کے مزے لینے لگتا ہے ——— جیسے کرسی اور ایڈیٹر میں چولی دامن کا ساتھ ہے ———

ابھی بیچارے کی آنکھ ہی لگتی ہے کہ ٹیلی پرنٹر والوں کو مذاق کی سوجھتی ہے۔ وہ ٹیلی پرنٹر مشین پر جو دفتر کے ایک گوشے میں ایستادہ ہے آخری خبریں بھیجنا شروع کر دیتے ہیں جیسے ہی مشین کی گھنٹی بجتی ہے۔ خوابیدہ ایڈیٹر بُری طرح چونک پڑتا ہے۔ اُسے محسوس ہوتا ہے۔ جیسے اُس کے دماغ پر کوئی "ایٹم بم" پھٹا ہو ———

لیجیے پھر غریب کولہو کا بیل بن گیا۔ جہاں سے چلا تھا۔ پھر وہیں آگیا دنیا ہی گول نہیں، اخبار کا دفتر بھی گول ہوتا ہے۔ ٹیلی پرنٹر مشین سے ٹائپ شدہ انگریزی نیوز کی چٹیں پھاڑ پھاڑ کر سلیس اردو میں ترجمہ کرتا جاتا ہے اور کاتب حضرات کی طرف جھنجھلا کر پھینکتا رہتا ہے! وہ دل ہی دل میں ٹیلی پرنٹر مشین کے موجد کو بے نقط سُنا سُنا کر دل کی لگی کو ٹھنڈا کرتا ہے۔ اسی پر بس نہیں۔ اے لیجیے! "ٹرنک کال" والوں نے ستانا شروع کر دیا۔ غریب کی آنکھوں میں اپنی کس مپرسی کا عالم دیکھ کر آنسو آجاتے ہیں، مگر غنیمت ہے کہ گرتے نہیں۔

نوجوان حامد کو بی اے کر لینے کے بعد ایڈیٹر بننے کا بے حد شوق تھا اور اس شوق نے کسی حد تک جنون کی صورت اختیار کر لی تھی۔ چنانچہ اُس کی یہ تمنا جلد پوری ہوئی۔ اُسے ایک مقامی روزنامے کے ادارے میں مترجم کی جگہ معمولی مشاہرے پر مل گئی ——— اگر مشاہرہ نہ بھی ملتا۔ تو اُسے چنداں پروا نہ تھی۔ وہ اعزازی حیثیت سے کام کرنے پر بھی آمادہ تھا" دن پر دن گزرتے گئے۔ حامد فرائض ادارت کمالِ توجہ سے انجام دینے لگا۔ ابتدا میں اُسے خبروں کے ترجمے کا کام دیا گیا۔ لیکن حدِ درجہ ذہین

وقابل تھا، اب اُس سے چھوٹے چھوٹے نوٹ بھی لکھوائے جانے لگے۔ اتفاق وقت
دیکھیے کہ اخبار کا سن رسیدہ ایڈیٹر اچانک فالج کا شکار ہوا۔ اب ادارتِ اخبار
کی ذمہ داریوں کا بے پناہ بار حامد پر پڑ گیا۔ اور مفلوج ایڈیٹر کی دوا دارو دیکھ
بھال بھی حامد کے سر پڑی۔ غریب نے گھر جانا چھوڑ دیا۔ اپنی بیوہ ماں کو اس
حادثے کی اطلاع بھجوادی اور بس۔ ہر وقت فرائضِ ادارت ہیں اور تیمارداری؛
بہترین طبی خدمات حاصل کی گئیں۔ دل کھول کر روپیہ صرف کیا گیا۔ لیکن مفلوج
ایڈیٹر جان بر نہ ہو سکا۔ اپنی موت سے کچھ دیر پہلے اُس نے حامد کو اشارے سے
بُلا کر ایک سربمہر لفافہ دیا۔ اور اشارہ کر کے ہدایت کی کہ لفافہ اُس کے انتقال کے
کے بعد اخبار کے تمام عملہ کے سامنے کھول کر پڑھا جائے۔

ایڈیٹر کی تجہیز و تکفین سے فارغ ہو کر تمام ادارتی عملہ کو حامد نے جمع
کیا اور ایڈیٹر کا دیا ہوا لفافہ چاک کیا۔ لکھا تھا۔

اپنے انتقال کے بعد میں اخبار کی ملکیت کے تمام حقوق وفادار و
ایماندار حامد کو بہ رضا و رغبت دیتا ہوں۔ اخبار کا ادارہ بدستور اپنا کام
کریگا۔ میرے انتقال کے دن اخبار بند نہ ہونا چاہئیے۔ امپیریل بنک میں اخبار
کی آمدنی سے پس انداز کیا ہوا تیس ہزار روپیہ میں حامد کے نام منتقل
کرتا ہوں۔

تیس ہزار کا ایک چک حامد کے نام میرے دستخط اور پرائیویٹ مہر
کے ساتھ ہے اور اُس پر شہر کے دو معزز وکیلوں کی گواہی کے دستخط ہیں اس
روپیہ کو بنک ہی میں آئندہ صحافتی حوادث کیلئے محفوظ رکھا جائے۔ اخبار کا
ماہانہ خرچ تقریباً ڈیڑھ ہزار روپے ہے۔ یہ رقم کل ماہانہ آمدنی میں سے وضع
کر کے بقیہ رقم مختلف قومی، ادبی اور اصلاحی اداروں میں ماہانہ تقسیم کر دی جایا
کرے۔ تقسیم اور اداروں کے انتخاب کا فیصلہ حامد اور حامد کا ادارہ کر سکتا ہے
حامد خط پڑھتا جاتا تھا۔ اُس کی آنکھیں پُرنم اور آواز گلوگیر ہوتی جاتی
تھی۔

اب حامد نے اپنی والدہ کو بھی دفتر سے ملحق ایک مختصر لیکن خوشنما مکان
میں بلا لیا تھا۔ خدمت کیلئے ایک ملازم اور ایک ملازمہ رکھ لئے تھے۔ دن میں دو
دفعہ اپنی والدہ کی مزاج پُرسی کو جاتا، بقیہ سارا وقت اخبار کے دفتر میں صرف کرتا
کام اتنا بڑھ گیا تھا کہ اُسے سر اُٹھانے کی مہلت نہ ملتی تھی۔ آج پہلا دن تھا
کہ حامد نے عارضی حکومت کے معائب و محاسن پر ایک مختصر لیکن مدلل اداریہ لکھا۔
اندازِ نگارش کے اعتبار سے بھی یہ مقالہ ایک دلکش ادبی تحریر تھا۔ آج کے پرچے
کی ایک بھی کاپی دفتر واپس نہ آئی۔ اور اُس دن سے اخبار کی مانگ بڑھ گئی
اور پرچے کی اشاعت میں نمایاں اضافہ ہونے لگا۔

آج کی ڈاک میں خطوط، رسائل اور اخبارات کے ساتھ ایک سبز معطر
لفافہ بھی تھا۔ پتہ نہایت پاکیزہ اور حسین خط میں لکھا تھا۔ اُس نے سب سے
پہلے یہی لفافہ کھولا۔ اس میں کسی خاتون نے ایک غزل بغرضِ اشاعت بھیجی
تھی، وہی گُل و بلبل والے رنگ میں رنگی ہوئی۔ حامد فوراً رسید لکھنے بیٹھ گیا۔

محترمہ تسلیم!

آداب و نیاز۔

غزل موصول ہوئی، لیکن افسوس کہ اس کا رنگ بہت پامال و فرسودہ
ہے۔ نیز میرے اخبار میں غزلیں شائع نہیں ہوتیں، ہاں قومی و اصلاحی نظمیں
چھپ سکتی ہیں۔ میں انتہائی افسوس کے ساتھ بصد شکریہ آپ کی غزل واپس
کر رہا ہوں۔ اسے کسی ادبی ماہنامے کو بھیجدیجیے۔ شائع ہو جائے گی۔

اگر ان سطور سے آپ کی خاطر شکنی ہوئی ہو۔ تو از راہ کرم مجھے
معاف فرمائیں۔ کیا میں پھر آپ سے درخواست کروں کہ آپ نسوانی و معاشرتی
اصلاح کیطرف متوجہ ہوں، اور بھوک، افلاس، تعلیم، سرمایہ داری وغیرہ
عنوانات پر طبع آزمائی فرمائیں۔ والسلام

منتظر...... مخلص

حامد

ایک ہفتہ بعد پھر وہی سبز "مکتوبِ جمیل" موصول ہوا
لکھا تھا۔

مدیرِ محترم

تسلیم!

گرامی نامہ موصول ہوا۔ گرامی نامہ نہیں تھا، پیام صد بصیرت
تھا۔ شعر و ادب کے متعلق میں نہ صرف آپ کے خیالات کی قدر کرتی ہوں،
بلکہ لیجیے! حسبِ ارشاد یہ پہلی نگارش ارسالِ خدمت ہے

نغمۂ رجز

اے کہ رجز سے ہل گئی تیرے فضائے کائنات
تیغ کشائے جہد ہو، فاتحِ قلبِ سومنات
اے کہ ترا تھا دبدبہ حاصل صد سکندری!
تیرے وجودِ خاص سے فقر کی شاخ تھی ہری
تیری شہادتوں کا خوں دجلے میں اور فرات میں
تیری صداقتوں کا شور سینۂ شش جہات میں
پیکرِ حُر یہ کیا غضب! دوش پہ تیرے دام ہے
جسم ترا اسیر ہے، روح تری غلام ہے

دیکھئے! پھر مکرر التماس ہے کہ یہ میری فکرِ اولیں ہے۔ یقیناً معائب سے پاک نہیں براہ کرم نظرِ ثانی کرنے کے بعد شائع فرمائیے۔

آپ کی عقیدتمند
تسنیم

حامد نے اخبار کے پہلے صفحہ پر جلی عنوان کے ساتھ دوسرے دن نظم شائع کر دی۔ نیز اُس کی ایک کاپی بذریعہ رجسٹری تسنیم کو بھیجدی۔ نظم کے ساتھ حامد کا ایک مختصر نوٹ تھا......

"نغمۂ رجز" محترمہ تسنیم کا نقشِ اول یا فکرِ نو ہے، یقیناً جسے سُن کر قلوب تڑپ جائیں گے۔ اب دیکھئے نقشِ ثانی کیا کیا حشر بپا کرتا ہے۔"

حامد کے نوٹ کے ساتھ تسنیم کے بلند پایہ افکار کیا شائع ہوئے، خواتین لاہور کے علم دوست طبقے میں فخر و غرور اور احسنت و آفریں کی لہر دوڑ گئی۔

چار روز کے بعد تسنیم کی ایک دوسری نظم حامد کو موصول ہوئی۔

خفتہ روحِ ایشیا سے

تا کجا یہ شانہ و آئینہ! عریانی بخیر!
اے حیا پرور! بس اب اس بے حیائی سے گزر
پھول بھی کانٹوں میں تُلتے ہیں کہیں اے بے خبر!
لعنت ایسی زندگی پر تف ہے ایسے عیش پر
مغربی تہذیب کی تقلید میں اندھی نہ بن! [1]
اپنی عظمت کی بھی جانب ہاں خدارا اک نظر
"بزمِ خانہ" سے نکل! دنیائے جہد و فکر دیکھ
تو نہیں گھر کے لئے تیرے لئے ہیں بحر و بر
خفتہ روحِ ایشیا بیدار ہو، آزاد ہو!
تاکہ تیری مادرِ ہندوستاں دلشاد ہو!!

اب ہر ہفتہ تسنیم کی اصلاحی، انقلابی اور سماجی نظمیں حامد کو موصول ہونے لگیں۔ تسنیم کی روانیٔ طبع دیکھ کر حامد کے دل میں دفعتاً یہ خیال پیدا ہوا کہ کیوں نہ لاہور سے ایک نسوانی ماہنامہ نکالا جائے؟

جلد ہی اُس کا یہ ارادہ شرمندۂ عمل ہو گیا۔

اُس نے تسنیم کو حسبِ ذیل خط لکھا۔

محترمہ تسنیم!

آپ کی زود گوئی نے تو لاہور کیا، ہندوستان بھر سے لوہا منوا لیا ہے، جسے دیکھ کر میں نے یہ عزم راسخ کر لیا ہے۔ کہ لاہور کی ادبی فضا میں ایک نئے نسوانی ماہنامہ کا جلد اجرا کیا جائے۔ ماہنامہ کا نام بھی اتفاق سے ذہن میں آ گیا ہے

اگر بُرا نہ مانئے تو کہہ دوں۔ "تسنیم" بالکل نیا نام ہے۔ لیکن اس شرط کے ساتھ کہ آپ "تسنیم" کی اعزازی مدیرہ بننا منظور کریں۔ مشاہرہ آپ کو کچھ نہ دیا جائیگا۔ اس لئے کہ میں اسے آپ کے وقارِ نسوانی کی توہین سمجھتا ہوں کچھ اپنے نظم و نثر کے مضامین اور کچھ دوسری خواتین کے آپ بھیجدیں۔ اور کچھ میں جمع کر لونگا۔

براہ کرم آپ اپنی منظوری اور اجازت دیدیں۔ آخر اس میں آپ کا کیا بگڑتا ہے؟ آپ کے نام نامی سے ادب کو مزید ترقی و تقویت پہنچے گی کہہ دیجئے "ہاں" آپ کو "تسنیم" و "کوثر" کی قسم!

وہی دیوانۂ ادب
حامد

ایک ماہ کی طویل خاموشی کے بعد آج تسنیم کے اجازت نامے نے حامد کی مُردہ تمناؤں میں جان ڈال دی۔ مکتوب میں صرف اتنا لکھا تھا

سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے

دوسرے ہی دن "تسنیم" کا ڈیکلریشن داخل کر دیا گیا۔ اور منظوری کے بعد

[1] مغربی تہذیب کی طرف اشارہ ہے۔

اخبارات و رسائل کو اُس کے شاندار اشتہارات بھیجد یئے گئے۔

"تسنیم" کا پہلا نمبر نہایت آب و تاب سے نکلا۔ رسالہ پر مدیرہ کا نام تسنیم کے بجائے "تسنیم کوثر" لکھا تھا۔ لفظ "کوثر" کے اضافے نے تسنیم میں اور جان ڈال دی۔

چند ہی دنوں میں تسنیم کے تشنہ کاموں (خریداروں) کی تعداد ہزاروں تک پہنچ گئی۔ ماہِ اگست تھا۔ اتفاق سے تسنیم کی طبیعت کچھ ناساز تھی اسلئے حامد ہی کو پرچے کا سارا کام کرنا پڑا۔ اتفاق سے اُسے ایک مذاق سوجھا۔ رسالے ترتیب دیتے وقت حامد نے کچھ حسبِ ذیل تازہ شعر کہہ کر اپنی طرف سے شامل کر دیئے۔

پردہ

پردہ، کا مفہوم ہے عفت، حیا، پاکیزگی!
تو فقط مُنہ کو چھپانا پردہ سمجھی ہے مگر
عہدِ حاضر ہے بصیرت خیز آنکھیں کھول تُو
آہ اے دوشیزہ تاکے بہ حجابِ کم نظر
تا کجا ناز و ادائے حسن کی شیریں ادا
سامنے ہے اب ترے اک عرصہ گاہِ کربلا!
حجلۂ تاریک سے باہر نکل اک برق بن
ذرۂ ناچیز کب تک؟ آفتابِ شرق بن

اس نظم کا شائع ہونا تھا۔ کہ نسائیات کی دنیا میں قیامتیں بپا ہو گئیں۔ خصوصاً علم دوست ممتاز خواتین تو پروانۂ "تسنیم" بن گئیں۔ لیکن علیل تسنیم کو خبر تک نہیں ـــ لیکن جب لاہور کی ممتاز خواتین لگاتار عیادت کیلئے آنے لگیں۔ تو تسنیم ایک عجیب کشمکش و پیچ میں مبتلا ہو گئی۔

گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

اب تو لاہور کے تیور ہی بدل گئے۔ جس خاتونِ مشرق کو دیکھئے جبیں پُر شکن، اور عارض جمیل انگارہ سے نظر آتے ہیں۔

ہیں لیجیے

این گلِ دیگر شگفت
لیکن
خوش شگفت

یہ تھی حامد کے جریدہ کی سرخی جیسے موٹے حرفوں سے اُجاگر کیا گیا تھا سُرخی کے الفاظ یہ تھے۔

"ایک فعال انجمن اصلاح نسواں کی ضرورت"

جس میں "تسنیم" کی طرف سے خواتین ہند سے اپیل کی گئی تھی۔ کہ وہ اپنی تنظیم، اپنے حقوق اور اپنے شرف و عظمت کی نگرانی و تعمیر کے لئے جلد از جلد کوئی باعمل ادارہ قائم کریں۔

اپیل کا شائع ہونا تھا۔ کہ ہر طرف سے آوازۂ لبیک بلند ہؤا۔ اور اس ادارے کی شاخیں طول و عرضِ ہند میں بہت جلد پھیل گئیں۔ اب خواتین کے ایک کل ہند اجتماع کا اعلان ہؤا، جس پر ہر طرف سے احسنت و آفرین کہی گئی

بالآخر وہ دن بھی آگیا۔ جب شالامار باغ کو اس طرح سجایا گیا کہ اُس پر

فردوس بر روئے زمین است

کا گمان نہیں، یقین ہونے لگا۔

کارروائی شروع ہونے سے پہلے مدیرۂ "تسنیم" نے آنے والوں کو خوش آمدید کہا، اور یوں کہا ؎

اے خوش آں روز کہ آئی و بصد ناز آئی
بے حجابانہ سوئے محفلِ ما باز آئی (علامہ اقبال)

کئی معزز خواتین نے "حقوقِ نسواں" کے عنوان پر تقریریں کیں۔ چند کم سن بچیوں نے اپنی معصومانہ انقلابی و اصلاحی نظمیں سنائیں۔ اور جلسہ بحسن و خوبی ختم ہؤا۔

ابھی جلسے کا اختتام ہی تھا۔ کہ حاضرات کے جمِ غفیر سے ایک شور اُٹھا۔ ہماری تحریک کی مستقل صدر کون بہن ہیں؟

دفعتاً سب کی نگاہیں تسنیم کی طرف اُٹھ گئیں ـــ کسی نے نہ تحریک کی نہ تائید۔ تسنیم اصلاح نسواں کی تحریک کی مستقل صدر بن گئی۔

لیکن اُس وقت بیقرار حامد کہاں تھا؟ شالامار باغ کے اس کُنج میں جہاں اس کی پاک محبتیں تسنیم کے سرور آفریں عارض کی پرستش کیا کرتی رہتی تھیں۔

چند دنوں کے بعد تسنیم کی سرود آفرینیوں نے ارضِ ہند کے ہر چمن کو مست کر دیا۔ ع

یہ بھی عجیب پھول تھی گلشنِ روزگار میں!

حامد اپنے فرائضِ ادارت میں معروف ——— ایک جانب "پردہ" والے اشعار پڑھ کر بیقراری ——— اور دوسری سمت پر معنی سکوت۔ ع

کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

آخر ایک دن حامد کے سکوت سے تنگ آکر تسنیم نے پوچھ ہی لیا "کیوں صاحب؟ صفحہ ۱۲ پر یہ کس کی نظم شائع ہوئی ہے، جس کا عنوان ہے۔ "پردہ"؟

"ہاں تو کیا ہوا؟ اس استفسار کی کیا ضرورت؟"

"میری علالت کے دوران میں ماہنامہ میں ایک نظم بعنوان "پردہ" شائع ہوئی ہے......؟"

"تو پھر ———؟ حامد نے نظر اُٹھاتے ہوئے کہا۔ ع

کیا سانحہ گزرا یہ کہو اپنی ادا سے

کہنے کو تو حامد وارفتہ مزاجی میں یہ مصرعہ پڑھ گیا، لیکن بعد میں اُسے بے حد ندامت محسوس ہوئی۔ ع

عرضِ غم میں اُن سے کر کے اُف پشیماں کیا ہوا

یہ تو تھا اُس دیوانہ ایڈیٹر کا ذکر ——— اب سنئے روداد برائے بیت ——— لیکن تسنیم کے قلب پر اس بعنوانِ "پردہ" والے اشعار کا اس درجہ اثر پڑا۔ کہ آخر اس نے "نقابِ حُسن" اُلٹ ہی دیا اور تسنیم کی موجوں کو شانِ خرام دی سے

ہر ایک ذرے کو بخشی ہے تازگی میں نے
چمن میں پھونک دی اک روحِ زندگی میں نے

اتنے دنوں کے میل جول سے دونوں میں غیر ارادی طور پر ایک رشتۂ محبت استوار ہو گیا۔ اور اس رشتۂ محبت کی استواری نے ایک دائمی شکل اختیار کر لی

آخر ایک دن ———

حامد نے تسنیم سے کہا ——— "تمہیں دنیا میں تنہائی محسوس نہیں ہوتی؟"

"ہوتی ضرور ہے، لیکن میں اس چیز کو کوئی اہمیت نہیں دیتی" تسنیم نے مسکرا کر کہا۔

"لیکن "اہم حقیقت" اپنی انفرادیت تو منوا کر ہی دم لیتی ہے

خود اُن کا حسن ہو گا کسی دن نظارہ ساز
رہتی نہیں ہے کوئی حقیقت حجاب میں

کیا یہ اچھا نہیں۔ کہ ہم ایک رشتۂ محبت سے اپنی زندگی کو وابستہ کر دیں؟"

جواب میں ——— تسنیم کی جانب سے ایک مکمل سکوت! ع

"سکوت عرضِ محبت ہے۔ اس کو کیا کہئے؟"

کہا کچھ نہیں گیا، لیکن سنا زیادہ گیا
کیا محبت کے زبان عرض بھی ہوتی ہے؟

دو جوان دلوں کی کشش رنگ لا کر ہی رہی ——— حامد و تسنیم محبت کے دائمی رشتے میں منسلک ہو گئے

آج بھی یہ حسن و عشق کی دنیا لاہور کے شالامار باغ میں اکثر چہل قدمی کرتے پائی جاتی ہے ——— لیکن اس طرح کہ ———

ایک کے چہرے پر شباب کا پُر وقار جلال ——— اور ——— دوسرے کے عارض پر ایک زندگی بخش جمال!

غزل

از
جناب امر چند
قیسؔ

انعام پہ انعام ہے معلوم نہیں کیوں
دُشنام پہ دُشنام ہے معلوم نہیں کیوں

کچھ تم سے ہمیں کام تھا معلوم نہیں کیا
کچھ تم سے ہمیں کام ہے معلوم نہیں کیوں

تاریک مری صبح تھی اب آپ جو آئے
پُر نور مری شام ہے معلوم نہیں کیوں

ہر کام پہ حاوی ہے تری قدرتِ کامل
انسان پر الزام ہے معلوم نہیں کیوں

جب حسرتِ دیدار بھی باقی نہیں دل میں
پھر جلوہ لبِ بام ہے معلوم نہیں کیوں

مے خانہ بر انداز ہیں آنکھیں تو کسی کی
دل میرا تہی جام ہے معلوم نہیں کیوں

پردہ بھی ابھی رُخ سے اُٹھایا نہیں تو نے
مذکور ترا عام ہے معلوم نہیں کیوں

حُسن اپنی خطاؤں پہ بھی بے لوث مگر عشق
معصوم بھی بدنام ہے معلوم نہیں کیوں

نالاں تو مرے نام سے لیکن مرے لب پر
دن رات ترا نام ہے معلوم نہیں کیوں

کیا محتسب و واعظ و زاہد نہیں پیتے؟
مے خوار ہی بدنام ہے معلوم نہیں کیوں

کیا بھول بھلیاں ہے رہِ منزلِ الفت
آغاز نہ انجام ہے معلوم نہیں کیوں

ہر چند نہیں بوالہوسی نام کو اُس میں
قیسؔ اس پہ بھی بدنام ہے معلوم نہیں کیوں

دِل کی پیاس

از
محترمہ کے شاہدہ اخترؔ

مجھے کوئی جامِ محبت پلا دو
خدا کے لئے پیاس دل کی بجھا دو

اگر تم کو مجھ سے محبت نہیں ہے
مرے دل سے نقشِ محبت مٹا دو

قسم ہے تمہیں میری بے تابیوں کی
کوئی نغمۂ شادمانی سُنا دو

سحر دیکھ لے میری شامِ غریبی
ذرا رُخ سے گیسو کا پردہ ہٹا دو

مرے چاند کی آج آمد ہے اخترؔ
ستاروں سے کہہ دو کہ آنکھیں بچھا دو

(ایک ہندوستانی عورت کا نقطۂ نظر)

ہندوستان کے مرد کی قیمت تو سماج نے خود مقرر کر دی۔ وہ عورت کا حاکم ہو گیا۔ اور اسے ہر قسم کا اختیار بھی مل گیا۔ وجہ یہ تھی کہ سماج کی لگام مرد کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے جدھر گھمانا چاہا سماج گھوم گیا۔ اسی لئے مرد نے سوسائٹی پر اپنے لئے پوزیشن حاصل کر لی۔ اور وہ خود ساختہ حاکم بن بیٹھا۔

مگر بے چاری عورت ——— ! دیکھتی رہ گئی کچھ نہ کر سکی اسکی قسمت کا فیصلہ مرد کے ہاتھ تھا۔ خود غرض مرد کے ہاتھ ——— جس نے من مانی اسمبلی میں جو چاہا کر ڈالا۔ عورت کو جتنا گرا سکا گرایا۔ اور غریب عورت کو اس خود ساختہ عدالت میں کچھ کہنے کا موقع بھی نہ دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ عورت "بچہ بنانے کی فیکٹری" اور مرد کے مال و اسباب کی چوکیدار بن کر رہ گئی اسے اپنی زندگی پر بھی کوئی اختیار نہ رہا وہ بھی سماج نے مرد کی ملکیت قرار دیدی۔ اور ان سب باتوں کا انجام یہ ہوا کہ مرد اپنی خود مختاری کے زعم میں عورت کے دکھ درد سے لاپرواہ ہو گیا۔

ہندوستانی عورت نے یہاں بھی صبر سے کام لیا۔ اور دنیا کو دکھایا کہ مشرقی عورت صبر کی دیوی ہوتی ہے۔ برداشت کا ایک مجسمہ ہے جو شوہر کے ظلم و ستم اور قید و بند کے باوجود مرد کے لئے ہر حال میں راحت کا سبب بنی رہتی ہے۔ اور اتنی حق تلفیوں کے باوجود وہ حرف شکایت زبان پر نہیں لاتی۔ لیکن ان قربانیوں پر بھی وہ تکلیف کا شکار بنی رہتی ہے۔ آج کتنے گھرانے ایسے دکھائے جا سکتے ہیں جہاں کی عورتیں خوش و خرم ہوں اور تندرست بھی ہوں۔ میرا جواب یہ ہے کہ ہندوستان کے ہر گھر میں جہاں عورتیں رہتی ہیں ایک خاص افسوسناک وقت ضرور آتا ہو گا۔ جب کوئی عورت تڑپ رہی ہو اور اس کا مرد تفریح کے لئے جانے کی تیاری کر رہا ہو۔

ہندوستان کی اسی فیصدی جوان عورتیں ماہواری کی بیماریوں میں مبتلا ہیں اور انہیں ہر مہینہ کئی کئی دن سخت درد اور بے چینی کے ساتھ کاٹنے پڑتے ہیں۔ مگر کتنے مرد ہیں جو اپنی عورت کی اس تکلیف پر اس سے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوں؟ حالانکہ وہ اگر چاہیں تو چند پیسے خرچ کر کے عورت کو اس تکلیف وہ بیماری سے نجات دلا سکتے ہیں۔ اگر کسی عورت کو ماہواری تکلیف سے آتی ہو یا زیادہ یا کم یا رک کر آتی ہو یا بہت درد کے ساتھ ہوتی ہو اور ان دنوں میں اس کی کمر اور پیٹ و پنڈلیوں وغیرہ میں درد ہوتا ہو تو اس کا بہت آسان علاج ہے ایسی بیمار عورت کو صرف ایک شیشی دوا **"کورس"** کھلا دینے سے ماہواری ایام بالکل آسانی کے ساتھ ہر ماہ بغیر کسی درد کے صحیح مقدار میں باقاعدہ آنے لگتے ہیں۔ اور ماہواری کی ہر خرابی دور ہو کر ہر مہینہ باقاعدگی کے ساتھ آنے لگتی ہے۔ یہ دوا جس کا نام "کورس" ہے

لیڈی ڈاکٹر زنانہ دواخانہ بی۔ ایس ۳۴ دہلی کے

پتہ پر خط لکھکر بذریعہ وی۔ پی پارسل منگائی جا سکتی ہے ایک ہی شیشی سے عورت کی ماہواری کی سب خرابیاں ٹھیک ہو جاتی ہیں۔ ایک شیشی کورس کی قیمت دو روپے آٹھ آنے ہے۔ خط لکھکر منگا لینی چاہیئے محصول پارسل پر صرف نو آنے خرچ ہوں گے۔ اور اس طرح معمولی سی رقم سے آپ کی بے زبان عورت ہر ماہ کی مصیبت سے نجات حاصل کرے گی۔ اور پھر ہر مہینہ باقاعدہ بغیر درد اور بغیر تکلیف کے ماہواری سے فارغ ہو جایا کرے گی۔

یہ دوا تقریباً پندرہ سال سے ہندوستان میں مشہور ہے اور اب تو لاتعداد حکیم اور ڈاکٹر اپنی مریض عورتوں پر صرف اسی دوا کو استعمال کرتے ہیں۔ کیونکہ اس کی صرف ایک شیشی سے ماہواری باقاعدہ آنے لگتی ہے۔ اور درد وغیرہ اور بے قاعدگی کی تمام تکالیف ہو جاتی ہیں۔

(ٹیلیفون نمبر ۶۲۶۸)

رام مِلائی جوڑی

افسانہ

از

جناب حسن نجمی سکندرپوری

قصہ مختصر یہ کہ میرا کام ہے افسانے لکھنا، اور آپ کا کام ہے افسانے پڑھنا چاہے آپ رسالے خرید کر افسانے پڑھا کرتے ہوں یا کسی دوست سے عاریتاً لے کر۔ اس سے کوئی بحث نہیں، ہاں اتنا ضرور ہے کہ اس جنت نشان ہندوستان میں دوسرا طریقہ زیادہ رائج ہے اور آپ کسی نہ کسی طرح افسانے پڑھ لیا کرتے ہیں۔ اور میں کسی نہ کسی طرح افسانے لکھ لیا کرتا ہوں چاہے گھر میں راشن نہ ہونے کی وجہ سے، پیٹ میں چوہے دوڑا کریں یا گاندھی بھگت، لالہ چندو مل، مٹی کا تیل ایک روپیہ بوتل ہی کیوں نہ دیں، جب تک افسانہ مکمل نہ ہو۔ تیل آتا رہتا ہے اور بتی جلتی رہتی ہے یا یوں سمجھ لیجئے کہ جب تک تیل ختم نہ ہو اور بتی نہ بجھے افسانہ لکھنا جاری رہتا ہے۔ لیکن تیل ملنے کے باوجود، آج تقریباً تین مہینے سے نہ تو میں نے بتی جلائی۔ اور نہ کوئی افسانہ ہی لکھا۔

آپ کہیں گے کیوں؟ تو اس کا جواب بھی سُن لیجئے، عام طور پر اُردو زبان میں، فی الحال دو قسم کے افسانہ نگار پائے جاتے ہیں، ایک تو وہ جو کسی غریب کسان، مزدور یا رکشا والا پر افسانے لکھا کرتے ہیں، دوسرے وہ جو اپنے ہیرو اور ہیروئن کو کسی امیر گھرانے سے منتخب کرنے کے بعد پہلے اُن میں معمولی ملاقات کراتے ہیں، یہ ملاقات عام طور پر، ریل گاڑی کے زنانہ ڈبے، ہسپتال یا کسی کلب گھر میں ہوا کرتی ہے۔ ہیروئن مسلمان ہو یا ہندو، اس سے کوئی بحث نہیں۔ اس لئے کہ نئی تہذیب نے دونوں کو ایک ہی راہ پر گامزن کر دیا ہے۔ بہرکیف وہ زنانہ ڈبے میں اپنی تمام رعنائیوں کو سمیٹے ہوئے تنہا سفر کرتی ہے اور ہیرو صاحب جو خیر سے کاہل مگر جلد باز قسم کے ہوتے ہیں، ٹھیک اُس وقت سٹیشن تشریف لاتے ہیں۔ جب گاڑی کے روانہ ہونے کے لئے آخری گھنٹی بج چکی ہوتی ہے۔ اور ڈرائیور سیٹی دیکر سٹیم کھول چکا ہوتا ہے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پوری ٹرین میں کہیں جگہ نہ ملنے کی وجہ سے مجبور ہو کر آپ، اُسی زنانہ ڈبے میں کود پڑتے ہیں۔ جس میں ہیروئن صاحبہ جلوہ افروز ہوتی ہیں۔ دو چار سٹیشن ساتھ ساتھ سفر کرنے کے بعد تمام حجابات غائب ہو جاتے ہیں اور پھر عشق و محبت کے رنگین افسانے کی تیاری شروع ہو جاتی ہے۔

جو ملاقات ہسپتال میں ہوتی ہے۔ اس کا پس منظر قدرے خطرناک قسم کا ہوتا ہے۔ یعنی بعض دفعہ تو ہیرو اور ہیروئن دونوں کی موٹریں مخالف سمت سے آکر بلا وجہ ٹکرا جاتی ہیں۔ اور دونوں زخمی ہو کر ہسپتال کی راہ لیتے ہیں پہلو بہ پہلو بیڈ مل جانے کی وجہ سے ہوش میں آتے ہی ہیرو سب سے پہلے ہیروئین کو دیکھتا ہے اور ہیروئن، ہیرو کو۔ کہیں آپ اعتراض نہ کر بیٹھیں کہ صاحب عورت اور مرد کا بیڈ ایک ساتھ کیونکر ہو سکتا ہے، ہسپتال میں تو وارڈ الگ الگ بنے ہوتے ہیں۔ تو جناب یہ باتیں سودیشی ہسپتالوں میں ہوتی ہیں۔ بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ ہیرو صاحب ہیروئن کی موٹر کے نیچے آکر زخمی ہو جاتے ہیں۔ جو اکثر بالقصد ہوا کرتا ہے۔ ہیروئن صاحبہ اُنہیں ہسپتال لے جاتی ہیں اور پھر دوران عیادت میں، بے چاروں کو عشق کا روگ لگ جاتا ہے۔ کبھی کبھی اس ملاقات کا بندوبست ہسپتال میں یوں ہوتا ہے کہ ہیروئن صاحبہ نرس ہوتی ہیں اور ہیرو بیمار ——— یا ہیرو صاحب ڈاکٹر ہوتے ہیں اور .... ہیروئن مریضہ ——— اور پھر دونوں ایک ساتھ عشق کے مریض بن جاتے ہیں۔

کلب کی ملاقات چنداں خطرناک نہیں ہوتی۔ ہیروئن صاحبہ کبھی اپنا رومال گرا دیتی ہیں۔ جس پر صرف ہیرو صاحب ہی کی نظر پڑتی ہے جو اتفاق سے آنکھ والے ہوتے ہیں اور آگے بڑھ کر اُسے اُٹھا لینے کے بعد مسکراتے ہوئے ہیروئن صاحبہ کی خدمت میں پیش کر دیتے ہیں۔ یہی رومال بعد

میں اُن کا دل بن جاتا ہے۔ بعض اوقات کلب آتے وقت ہیروئن صاحبہ کی موٹر پنکچر ہو جاتی ہے۔ اور چاروناچار انہیں ہیرو کی موٹر میں سوار ہونا پڑتا ہے۔

عام افسانہ نگاروں کی تیسری قسم ابھی تک زیرِ تحقیق و تلاش ہے۔ خواص میں ایسے ضرور ہیں، جو اپنی افسانوی گاڑی عام رہگذر پر نہیں چلاتے، مگر یہ گنتی کے ہیں۔ مختصر یہ کہ فلمستان سے لیکر ہندوستان تک یہی دو قسم کے افسانہ نگار پائے جاتے ہیں۔ ہر سال کئی درجن تیار ہونے والی فلموں اور کئی سو چھپنے والی کتابوں میں انہیں کا بول بالا ہے۔ ان کی دُور رس نگاہوں نے کوئی موضوع ایسا نہیں چھوڑا جسے اُنہوں نے اپنے قلم سے نہ گدگدایا ہو۔ ایسی حالت میں آپ ہی فیصلہ کیجئے کہ میں لکھوں تو کیا لکھوں، تین مہینے بیت گئے۔ لیکن کوئی نیا پلاٹ نہیں سوجھا۔ وہ تو خیریت ہوئی جو کلکتہ میں ہندو مسلم فساد اُٹھ کھڑا ہوا۔ ورنہ ......؟؟؟

ورنہ بہت ممکن تھا کہ پلاٹ ڈھونڈتے ڈھونڈتے مجھے کچھ دن اور لگ جاتے۔ سمجھ میں نہیں آتا ہے اپنے خالص ہندوستانی لیڈروں کو کس قسم کی دعائیں دوں۔ آزادی کے رسیا، برطانوی گورنمنٹ سے لڑتے لڑتے خود آپس میں ٹکرا گئے۔ ہندوستانی سیاست کچھ ہے بھی ہرجائی قسم کی۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستانی لیڈر ہر سال ایک نیا چولا بدل لیتا ہے۔ یہ سودیشی لیڈر آج سے چند مہینے پہلے، کچھ تو جیلوں میں تھے اور کچھ جیل سے باہر۔ وقت کے بدلتے ہوئے تیور دیکھ کر برطانوی گورنمنٹ نے ان سب کو دہلی میں اکٹھا کیا۔ خیر سے ان کا دماغ فطرتاً گرم واقع ہوا ہے۔ چنانچہ انہیں دہلی سے سری نگر لے جایا گیا۔ لیکن وہاں کی سردی بھی اس فطری گرمی کو دور نہ کر سکی۔ مجبوراً لارڈ ویول نے سب کو آزاد کر دیا۔ وہاں سے نکلتے ہی الیکشن کی گہما گہمی شروع ہوئی۔ پھر مرکز میں عارضی قومی حکومت بنی۔ نیم آزاد ہندوستانی لیڈروں نے اب جو چولا بدلا تو کلکتہ میں ہندو مسلم فساد شروع ہو گیا۔ سنا ہے اور آپ نے بھی سنا ہو گا کہ تقریباً پانچ ہزار مارے گئے اور پندرہ ہزار زخمی ہوئے۔ کون جانے لیکن اتنا ضرور ہے۔ کہ کلکتہ کے اخبارات بات کا بتنگڑ بنانا خوب جانتے ہیں۔

خیر صاحب تو اس فساد کے شروع ہونے سے ایک ہفتہ قبل میری ہیروئن صاحبہ کلکتہ تشریف لائی تھیں، ساتھ ایک نوکرانی اور دو نوکر تھے۔

لوگ کہتے ہیں کہ کلکتہ میں مکانوں کی بڑی قلت ہے۔ چراغ لے کر ڈھونڈنے پر بھی مکان نہیں ملتے۔ مگر میری ہیروئن صاحبہ جب مکان ڈھونڈنے نکلیں تو اُنہیں سارا کلکتہ خالی ملا۔ جس کوٹھی والے نے اُن کی طرف ایک بار آنکھ اُٹھا کر دیکھا، لٹو ہو گیا۔ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے بنگال کا جادو اپنی تمام سحر آفرینیوں کے ساتھ، اُس کے سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا۔ لیکن میری بی اے پاس ہیروئن صاحبہ اتنی بھولی بھالی نہیں تھیں۔ جو ہیرو صاحب کے سوا کسی دوسرے کے ہتھکنڈے میں آتیں۔ فریب دینے اور فریب کھانے کے تمام گر اُنہیں معلوم ہو چکے تھے، کالج میں اُنہوں نے بھاڑ جھونکا تھا ہی جھونکا تھا۔ تعلیم حاصل کرتی رہیں۔

بہرکیف، طرحدار مکان یا مالک مکان کی تلاش کرتے کرتے وہ میرے ہیرو صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔ ہیرو صاحب کا ناک نقشہ کچھ ایسا دلکش تھا۔ کہ اُنہیں دیکھتے ہی ہیروئن صاحبہ کے ہوش و حواس تھوڑی دیر کیلئے ہوا میں قلابازیاں کھانے لگے۔ ہیرو صاحب کا بھی کم و بیش یہی حال تھا۔ جب ہوش ٹھکانے لگے تو ہیروئن صاحبہ یہ دیکھ کر قدرے کھسیانی سی ہو گئیں۔ کہ ہیرو صاحب ویسے ہی اپنی آرام کرسی پر دراز تھے۔ حالانکہ اس سے پہلے وہ جہاں بھی مکان ڈھونڈنے گئیں۔ مالکان مکان نے اُنہیں سر آنکھوں پر بیٹھایا۔ مگر یہ مغرور چھوکرا

اُنہیں بڑی خفت محسوس ہوئی۔ مگر کرتیں کیا۔ مکان سے زیادہ مالک مکان پسند تھا۔ چنانچہ دل پر جبر کر کے دانت پیستے ہوئے بولیں۔

"مجھے کرائے پر ایک کمرہ چاہیئے۔"

ہیرو صاحب اُس وقت غالباً جنت کی سیر کرنے میں مصروف تھے اسی لئے تو ہیروئن صاحبہ کی نغمہ ریز آواز اُن کے تخیل کے کانوں تک نہیں پہنچی۔ ہیروئن صاحبہ نے معاملے کی تہ تک پہنچتے ہوئے اپنی نوکرانی کی طرف اشارہ کیا۔ "دیکھ بینا! ان کے کان کے پاس منہ لے جا کر ذرا زور سے آواز دے، معلوم ہوتا ہے۔ کم سنتے ہیں"۔ بینا نے جونہی حکم کی تعمیل کی، ہیرو صاحب ایک دم سے چونک پڑے۔ اور قدرے شرمندگی محسوس کرتے ہوئے بولے۔ "معاف کیجئے گا۔ چوٹ لگ جانے کی وجہ سے میری داہنی ٹانگ میں سخت قسم کا درد ہو رہا ہے۔ میں کئی دن سے پریشان ہوں" بغل کی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے۔ "تشریف رکھئے

ہیروئن صاحبہ مسکراتی ہوئی، کرسی پر جلوہ افروز ہو گئیں۔

"کہئے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں" ہیرو صاحب نے اپنی ں ٹانگ کھجاتے ہوئے کہا۔

"مجھے ایک کمرہ چاہیئے" ہیروئن صاحبہ نے نینوں کے بان چلاتے ے کہا۔

"کمرہ" ہیرو صاحب نے آنکھوں کو خالص مالکانہ انداز میں گھماتے ئے تعجب سے کہا "اوہ کوئی بات نہیں۔ میں اپنے بازو کا کمرہ خالی کرا ونگا۔ اُس کو میں نے ریڈنگ روم بنا رکھا ہے۔ اس پوری بلڈنگ کو پ اپنا ہی گھر سمجھئے۔ کرائے وغیرہ کے متعلق بھی آپ کوئی فکر نہ کریں بعد ں سب کچھ ہو جائیگا۔"

ہیروئن صاحبہ نے خالص انگریزی میں شکریہ ادا کیا۔ اور شام و سامان وغیرہ لے کر آنے کا وعدہ کر کے چلی گئیں۔ اُن کے جانے کے بہت یر بعد تک ہیرو صاحب کو ایسا محسوس ہوتا رہا۔ جیسے ہوائیں گنگنا ہی تھیں اور فضاؤں سے پھول برس رہے تھے۔ ہیروئن صاحبہ حسب عدہ شام کو نوکروں سمیت وارد ہو گئیں۔ اور دوسرے دن سے اُن کی ندگی کی گاڑی اپنی پوری رفتار سے چلنے لگی۔ ہیروئن صاحبہ کو اس ے ماحول میں رہتے ہوئے چار پانچ دن ہو چکے تھے۔ اُنہیں کسی و..ہ ر سکون ہو جانا چاہیئے تھا۔ جس سکول میں وہ اسسٹنٹ ہیڈ مسٹرس تھیں، وہاں کی ایک دو اُستانیاں بھی اب اُن کا دل بہلانے کے لئے آنے لگی تھیں۔ لیکن اُن کی پریشانی کا ہنوز روز اوّل تھا۔ سکول سے واپس ہوتے ہی وہ منہ ہاتھ دھونے سے پہلے اپنی نوکرانی سے پوچھتیں۔ "کیوں ...ی بیٹا! آج بھی بابو جی اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلے"۔ بیٹا منہ بسورتے ہوئے جواب دیتی۔ "نہیں رانی جی"۔ دراصل معاملہ یہ تھا۔ کہ میرے ہیرو صاحب کا ناک نقشہ تو ہیروئن صاحبہ کو پسند تھا۔ لیکن اُن کی زندگی کچھ پُراسرار قسم کی تھی۔ وہ دن بھر اپنے کمرے میں بند پڑے رہتے۔ صبح ہو یا شام اُنہیں مطالعہ کرنے اور سونے سے کام تھا۔ جب کبھی طبیعت اُکتاتی۔ ریڈیو بجانا شروع کر دیتے یا کبھی کبھی اپنے مخصوص دوستوں کو بُلا کر تاش کھیلنے میں مصروف ہو جاتے۔ اس کے سوا اُن کا اور کوئی کام نہ تھا۔ نہ کہیں آنا جانا تھا۔ ہیروئن صاحبہ نے ایک بار اپنے نوکر سے خیریت دریافت بھی کرائی۔ تو معلوم ہوا۔ کہ ٹانگ کا درد ابھی کم نہیں ہوا۔ مجبوراً خود بھی ایک بار مزاج پرسی کے لئے تشریف لے گئیں۔ اُس وقت بھی یہی جواب ملا۔ حالانکہ ہیرو صاحب کافی ہشاش بشاش نظر آ رہے تھے۔

اُدھر، ہیروئن صاحبہ کے متعلق بھی ہیرو صاحب کم و بیش اسی اُلجھن میں مبتلا تھے۔ اُن کے لئے ہیروئن صاحبہ بھی ایک پُراسرار ہستی سے کم نہ تھیں۔ وہ گریجویٹ تھیں۔ اُنھوں نے مدتوں کالج کی حسین و رنگین فضا میں سانس لی تھی۔ وہ تہذیبِ جدید کے آداب سے بخوبی واقف تھیں۔ پھر بھی اُن کے لباس سے قدامت کی بُو آتی تھی۔ ایسے دَور میں جب فیشن پرست لڑکیاں ساڑی اس لئے نہیں باندھتیں۔ کہ اُن کا جسم چھپا رہے۔ بلکہ اس کا مقصد گوری گوری سڈول باہوں، اُبھرے ہوئے سینوں اور بل کھاتی ہوئی کمروں کی نمائش ہوتا ہے۔ ہیروئن صاحبہ کا اس طرح ساڑی باندھنا۔ کہ سوا چہرے کے جسم کا اور کوئی حصہ نظر نہ آئے۔ ایک عجیب وغریب بات تھی۔ اور ہیرو صاحب اس معمے کو جتنا حل کرتے۔ اُتنا ہی اُلجھتے جاتے۔ غرض دونوں طرف تھی آگ برابر لگی ہوئی

یہاں تک کہ پہلا ہفتہ ختم ہوا۔ ۱۵ اگست کی بھیانک رات ختم ہوئی۔ اور ۱۶ اگست کا خونیں سورج نکلا۔ کلکتہ کے اندر دن کے دس بجے تک زندگی کے ہنگامے حسب معمول تھے۔ اتنا ضرور تھا۔ کہ مسلمان اپنا سارا کاروبار بند کر کے "ڈائرکٹ ایکشن" منانے کی تیاری کر رہے تھے۔ اُن کے محلوں میں چاروں طرف ہری ہری جھنڈیاں لہرا رہی تھیں۔ اُدھر ہندو محلوں میں ایک طرح کی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ کہیں کہیں سرگوشیاں ہو رہی تھیں۔ بے بنیاد افواہوں کی وجہ سے کہیں کہیں چہروں پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ میری ہیروئن صاحبہ حسب معمول دس بجے بن سنور کر تیار ہوئیں۔ اور آنچل سنبھالتی، قدم قدم پر بل کھاتی ہوئی باہر نکلیں۔ ہیرو صاحب نے جو اتفاق سے اُس روز اپنے دروازے پر بیٹھے تھے۔ اُنہیں دیکھ لیا اور مسکرا کر بولے "معاف کیجئے گا۔ آج تو غالباً تعطیل ہے۔ پھر آپ ......" ہیروئن صاحبہ نے معنی خیز نظروں سے اُن کی طرف دیکھتے ہوئے، اُن کے منہ کا جملہ چھین کر جواب دیا۔ "پھر میں سکول کیوں جا رہی ہوں۔ یہی نا۔ لیکن آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں ہیڈ مسٹرس صاحبہ کے یہاں جا رہی ہوں۔ وہاں آج ایک چھوٹی موٹی

ٹی پارٹی ہے"۔

ہیروئن صاحبہ کو باہر نکلے ہوئے ابھی دس پندرہ منٹ ہی ہوئے ہونگے کہ وہ ہانپتی کانپتی واپس آگئیں۔ ہیڈ مسٹرس صاحبہ کے مکان کے سامنے وہ بس سے اُتر رہی تھیں۔ کہ یکایک لوگ چلّا اُٹھے۔ "ہوڑہ پل کے پاس ہندو مسلم فساد شروع ہوگیا"۔ بس پھر کیا تھا۔ چاروں طرف بھاگ دوڑ مچ گئی اور دھڑادھڑ دکانیں بند ہونے لگیں۔ ہیروئن صاحبہ کے تو پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ غریب کی سمجھ ہی میں نہیں آتا تھا۔ کہ کیا کریں اور کیا نہ کریں۔ فرقہ وار فساد میں کیا ہوتا ہے؟ اُس کا اُنہیں بالکل علم نہ تھا۔ اگر ہوشیار اور تجربہ کار ہوتیں۔ تو ایسی جگہ چلی جاتیں، جہاں اُن کے فرقے والے اکثریت میں ہوتے۔ لیکن یہ سوچ کر کہ اُن کے دونوں نوکر اور بیٹا اُن کی جان بچالے گی۔ وہ گھر کی طرف لوٹ پڑیں۔ سب سے زیادہ بھروسہ اُنہیں ہیرو پر تھا۔ افواہیں اُن سے زیادہ تیز رفتار تھیں۔ اُن کے مکان میں پہنچنے سے پہلے ہی یہاں بھاگ دوڑ مچ گئی تھی۔ نچلی منزل کے رہنے والے اینٹ، پتھر، لاٹھیاں اور چھُریاں ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔ وہ سیدھی ہیرو کے پاس گئیں، اُن کا چہرہ بھی فق تھا۔ اُنھوں نے ہیروئن صاحبہ کو دیکھتے ہی سوال کیا؛ آپ کیونکر صحیح سلامت آگئیں"؟

"یہ مت پوچھئے۔ یہ بتائیے کہ اب کیا ہوگا؟" ہیروئن صاحبہ نے اُلٹے سوال کر دیا۔

"کیا ہوگا؟ یہی تو میں بھی سوچ رہا ہوں"۔

"میرا تو خیال ہے اس علاقے میں کچھ نہ ہوگا۔ اس لئے کہ یہاں کم و بیش سبھی پڑھے لکھے ہیں۔ اس سے زیادہ میں کچھ کہہ نہیں سکتی، آپ جانیں"۔

"بات تو ٹھیک ہے۔ پھر بھی محتاط رہنا چاہیئے"۔

"اگر آپ کے خیال میں اس سے زیادہ محفوظ جگہ کوئی ہو۔ تو وہیں چلنے کا بندوبست کیجئے"۔

"ہرگز نہیں۔ ایسا کرنا خطرہ مول لینا ہے"۔

جان بچانے کے اہم مسئلے پر غور کرتے ہوئے بھی میرے ہیرو اور ہیروئن کے تحت الشعور میں وہ معمے حل ہو رہے تھے۔ جن کے حل کرنے کی متواتر دس دن سے کوشش کی جا رہی تھی۔ ہیروئن صاحبہ نے تو یہاں تک تہیہ کر لیا تھا۔ کہ آج وہ اپنے دل چھیننے والے کی ٹانگ دیکھ کر ہی واپس ہونگی۔ ٹانگ میں کہاں اور کیسی چوٹ لگی تھی جو اچھا ہونے کا نام نہیں لیتی۔ بار بار اُن کے ذہن کے پردوں سے یہی سوال تکرار ہا تھا۔ ادھر ہیرو صاحب بھی کچھ بے چین سے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ بھی کچھ کہنا چاہتے تھے۔ مگر کہہ نہیں سکتے تھے۔ اُن کا دل بھی بار بار یہ جاننے کا تقاضا کر رہا تھا۔ کہ ہیروئن صاحبہ بیسویں صدی کی پیداوار ہوتے ہوئے بھی ساڑھی اس طرح کیوں باندھتی ہیں۔ کہ اُن کی دونوں باہیں چھُپی رہتی ہیں۔ اُس روز شاید یہ معمّا حل بھی ہو جاتا۔ کہ ناگہاں باہر سے چیخنے چلّانے کی آوازیں آنے لگیں

بابوجی ——— رانی جی ——— بابوجی ——— رانی جی

——— باہر مار کاٹ ہو رہی ہے۔ ہیروئن صاحبہ تو مار کاٹ کی خبر سنتے ہی تلملا اُٹھیں۔ اور جھٹ پٹ کھڑکی کے پاس جا کر سڑک کی طرف جھانکنے لگیں۔ اینٹ، پتھر، لاٹھی، چھُری اور بھالے کا آزادانہ استعمال ہو رہا تھا۔ کھٹ پٹ، آہیں، چیخیں، خون، لاشیں، ہیروئن صاحبہ نے ایک نگاہ میں نہ جانے کیا کیا دیکھا۔ اور "او مائی گاڈ" کہتی ہوئی کھڑکی چھوڑ کر اندر واپس آگئیں۔ اُن کا خیال تھا کہ اُن کی پریشانی دیکھ کر ہیرو صاحب بھی، ہاتھ پاؤں چلانا شروع کر دینگے۔ مگر وہاں تو سکتے کا عالم تھا۔ جیسے کوئی آنکھیں کھول کر سو رہا ہو۔ ہیروئن صاحبہ کو دوبارہ اپنی جگہ جلوہ افروز دیکھ کر، وہ چونک پڑے اور مری مری سی آواز میں بولے۔ "بہتر ہوگا آپ اپنا کمرہ بند کر کے نوکر اور نوکرانی سمیت یہاں آجائیں۔ ایسی حالت میں ہم سبھوں کا ایک جگہ رہنا زیادہ اچھا ہوگا"۔

لیکن ہیروئن صاحبہ کے نوکر راضی نہ ہوئے۔ اُن کا کہنا تھا، "رانی جی! آپ یہیں رہئے۔ پہلے ہماری جان جائے گی۔ بعد میں آپ کی"۔ ہیروئن صاحبہ کو مجبوراً جھکنا پڑا۔ وقت ہی کچھ ایسا تھا۔ واقعات و حادثات کی رفتار، تیز سے تیز تر ہوتی گئی۔ جے ہند اور اللہ اکبر کے نام پر آدمی، آدمی کی گردن اُڑا تا رہا۔ دکانیں لوٹی گئیں، عورتوں

اور بچوں تک کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ یوں ہی شام ہو گئی۔ سورج ان شرمناک اور انسانیت سوز مناظر کی تاب نہ لا کر اپنی کرنوں کو سمیٹتا ہوا غائب ہو گیا۔ بھیانک رات اپنی تمام ہولناکیوں کے ساتھ آئی۔ چاروں طرف سناٹا چھا گیا۔ لوگ اپنے کمروں میں بیٹھے ہوئے موت کی گھڑیاں گن رہے تھے کہ یکایک رات کے دس بجے پھر جے ہند اور اللہ اکبر کی آواز اُٹھنا شروع ہو گئی۔ اب کی دفعہ بلوائی آگے بڑھتے بڑھتے ہیرو کے مکان تک پہنچ گئے۔ چاروں طرف سے تڑاق پڑاق کی آوازیں آنے لگیں۔ ہیرو صاحب نے ہمت کر کے اپنا دروازہ کھولا۔ اور باہر کی طرف جھانکنے لگے۔ بلوائی اب اُن کا پھاٹک توڑنے لگے تھے۔ اُن بیچاروں کا دم نکل گیا۔ اُنہوں نے پلٹ کر ٹیلیفون اُٹھایا اور پولیس کو خبر دی۔ مگر کوئی جواب نہیں۔ دوبارہ۔ تین بار۔ دس بار۔ بیس بار، وہ تھک کر بیٹھ گئے۔ بیٹھنا ہی تھا۔ کہ کسی نے باہر سے دروازے پر دستک دی، ہیرو صاحب کا تو خون سوکھ گیا۔ لیکن "بابوجی" کی مانوس آواز اُن کے کان میں پڑتے ہی جیسے اُن کی روح واپس آگئی۔ اور دھیرے سے بولے "کون"۔

"میں ہوں دروازہ کھولئے نا میرے دونوں نوکروں کو غنڈوں نے چھری بھونک دی۔ بیچارے اُنہیں سمجھانے گئے تھے۔ پھاٹک کے پاس اُن کی لاشیں پڑی ہوئی ہیں۔ کوٹھی کے تمام لوگ بھاگ گئے۔ بینا بھی غائب ہو گئی۔ میں تن تنہا ہوں۔ بلوائی اندر گھس کر لوٹ مار مچا رہے ہیں۔ جلدی کیجئے نا۔ دروازہ کھولئے"۔ !

ہیرو صاحب چارپائی کا سہارا لیتے ہوئے دروازے تک پہنچے اور بڑی مشکل سے چٹکنی کھولی۔ دروازہ کھلتے ہی اُدھر ہیروئن صاحبہ تیزی سے اندر گھس کر کرسی پر دراز ہوئیں، اِدھر ہیرو صاحب نہ جانے کیوں چاروں شانے چت زمین پر گر پڑے۔ ہیروئن صاحبہ گھبرا کر کھڑی ہو گئیں اور ہیرو صاحب کو فرشِ راہ دیکھ کر بولیں "ارے ارے آپ کو تو چکر آگیا"۔

"چکر نہیں آیا بھائی"۔ ہیرو صاحب نے دھیرے سے جواب دیا۔ "میں ایک ٹانگ کا آدمی ہوں۔ جلدی میں ٹانگ بھی تو نہیں باندھ سکا۔ مجھے ذرا سہارا دیجئے"۔

چاروناچار ہیروئن صاحبہ نے آگے بڑھ کر اپنا داہنا ہاتھ ہیرو صاحب کی گردن کے نیچے لگا دیا۔ اور اُنہیں اُٹھانے لگیں۔ ہیرو صاحب نے اپنا ایک ہاتھ زمین پر ٹیک دیا۔ اور دوسرے ہاتھ سے ہیروئن صاحبہ کے بائیں ہاتھ کا سہارا لینا چاہا۔ لیکن وہاں ہاتھ کہاں؟ ہاتھ کی جگہ، ہیروئن صاحبہ کی پتلی کمر تھی وہ گھبرا کر چلا اُٹھے۔ "ارے ارے آپ کا ہاتھ کہاں ہے؟"

"ہاتھ" ہیروئن صاحبہ نے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ جو ابھی تک کھلا ہوا تھا۔ "وہ تو کمرے میں رہ گیا ہے۔ بینا ہے نہیں۔ پھر ہاتھ باندھے گا کون؟ ٹھہریئے میں دوڑ کر لیتی آؤں"۔

"نہیں نہیں"۔ ہیرو صاحب نے اُنہیں روکتے ہوئے کہا۔ "آپ باہر نہ جایئے۔ بلکہ دروازہ بند کر کے سوئچ آف کر دیجئے۔ بلوائیوں نے ہمیں دیکھ لیا تو ——— ؟؟؟ صبح دیکھا جائیگا ؂

غزل

از
جناب رفعت سروش

بڑی آرزو ہے کوئی مری انجمن میں آئے
مرے دل کی خلوتوں میں وہ عجب ادا سے آئے
یہ حیات کیسے گزرے بڑی کشمکش ہے اے دل!
تری یاد میں شبِ غم بڑے لطف سے گزاری

مرے سازِ بے صدا کا کوئی تار گنگنائے
کبھی بجلیاں سی تڑپیں کبھی پھول مسکرائے
نہ کوئی خوشی میسر نہ الم ہی راس آئے
کبھی تجھ سے گفتگو کی، کبھی شعر گنگنائے

یہ جمود میکدے میں، یہ سکوت، یہ اداسی
وہ شراب تیز ساقی کہ قرار ہی نہ آئے

نغمہ

از
جناب نازش پرتاب گڑھی

ہے محوِ نغمہ کلیسا کی ایک مہ پارہ
سرور و نور و بہار و شفق کا گہوارہ

نگاہ بہکی ہوئی سی شباب کھویا سا
کنارِ بحر میں طوفان جیسے سویا سا

بدن سمیٹے ہوئے اور نظر جھکائے ہوئے
ہے دستِ ناز میں نازک رباب اُٹھائے ہوئے

فضا میں پھیلتا جاتا ہے نشتریں نغمہ
دلوں کو لوٹے سے لیتا ہے یہ حسیں نغمہ

یہ مہ جبیں ہے کہ اک چشمہ زارِ نغمہ ہے
یہ سُرخ ہونٹ ہیں یا آبشارِ نغمہ ہے

کچھ اس طرح سے "یہ آواز" کو اُٹھاتی ہے
زبانِ سنگ سے "توبہ" نکل ہی جاتی ہے

ہر ایک سینے میں نشتر سا چبھتا جاتا ہے
یہ بے پناہ ترنم کہ وجد آتا ہے

سرود و نغمہ میں ڈوبی ہوئی ہے ہر شے آج
سکوتِ صبح کی چھاتی دھڑک رہی ہے آج

ستارِ آتشِ نغمہ سے گل نہ جائے کہیں
تمام عالمِ امکاں پگھل نہ جائے کہیں

نظر سے اُس کی نگاہوں کو چومتا ہوں میں
دل و جگر متزنم ہیں جھومتا ہوں میں

یہ سحر چھین لوں اعجاز چھین لوں بڑھ کر
جو بس چلے تو یہ آواز چھین لوں بڑھ کر

حسین نغمہ ادھورا ہی چھوڑ دے کوئی
خدا کے واسطے یہ ساز توڑ دے کوئی

مشورے

از
جناب گلزار حسین نسیم

روزِ الست کے ہر ایک بھید کو پا کے بھول جا
اپنے حریمِ فکر کے پردے اُٹھا کے بھول جا

تجھ کو ہنسی ہنسی ہی میں بھول گیا اگر کوئی
تُو بھی کسی کی یاد کو اشک بہا کے بھول جا

عشق ہے آتشِ خموش، اس کا مآل غم فزا
صورتِ شمعِ حسرتیں دل کی جلا کے بھول جا

اپنی نگاہِ ناز سے جس نے تجھے گرا دیا
اپنی نظر سے تُو بھی اب اُس کو گرا کے بھول جا

اپنی دعا سے کام رکھ، تجھ کو صلے سے کیا غرض
اپنے دُکھوں کی داستاں اُن کو سنا کے بھول جا

بجلیاں تیری تاک میں، گردشیں تیری منتظر
تُو بھی اب اے رہینِ عزم بگڑی بنا کے بھول جا

ساقی لُٹا رہا ہے مے محفلِ عیش میں نسیم
اپنے حواس و ہوش کو تُو بھی لُٹا کے بھول جا

شیش محل

افسانہ

از

جناب انور سدید

ڈاک گھر کی کھڑکی کے سامنے بیٹھے بیٹھے نہ جانے آج میری طبیعت کیوں اُکتا گئی، مجھے اپنے آپ سے وحشت ہونے لگی، میرے خیالات مجھ سے بغاوت کرنے لگے۔ جی چاہا یہاں سے بھاگ جاؤں۔ اس جگہ کو چھوڑ دوں، مجھے اب اس جگہ سے نفرت ہو گئی ہے —— ہیڈ کلرک کی میز سے پرے بیٹھی ہوئی ٹائپسٹ لڑکی کو آج میں نے پہلی بار مرغوب نگاہوں سے دیکھا، کوئی رسالہ پڑھ رہی تھی۔ شاید میں اسے دیر تک دیکھتا رہا۔ اور پھر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میری روح پر سے ایک بہت بڑا بوجھ اتر گیا ہے۔ طبیعت کی ساری پریشانی جیسے دور ہو گئی ہے۔ روح کی ساری کوفت جیسے ختم ہو گئی ہے۔

آج شام آفس سے نکلتے وقت میری اس سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ وہ دروازے سے پرے سائیکل سٹینڈ کے پاس مغموم صورت بنائے کھڑی تھی۔ میرا دل بھی نہ جانے کیوں اندر ہی اندر بیٹھنے لگا۔

"کیا بات ہے مس روزا۔ آج آپ بے حد پریشان نظر آ رہی ہیں"۔

"سائیکل پنکچر ہو گیا ہے مسٹر ہاشمی"۔

"آیئے کسی قریبی دکان سے پنکچر لگوا لیں"۔

سائیکلوں کی دکان تک ہم دونوں اکٹھے گئے۔ باتوں باتوں میں اس نے مجھے بتایا۔ کہ اسے افسانے پڑھنے کا بے حد شوق ہے۔ اور اب تو اس شوق نے بڑھتے بڑھتے ایک قسم کے جنون کی شکل اختیار کر لی ہے۔ مجھے اگرچہ ادبی مطبوعات پڑھنے کا ذرا شوق بھی نہیں۔ لیکن اس کے باوجود اس کے دل میں جگہ حاصل کرنے کے لئے میں نے کہہ دیا۔ کہ میں بھی افسانے لکھتا ہوں۔

"آپ کے افسانے بھی رسائل میں شائع ہوتے ہیں"۔

اس نے مجھے حیران کن نگاہوں سے دیکھا۔ اور میں نے اسے یقین دلانے کے انداز میں کہا۔

"حال ہی میں مجھے ایک ادبی مقابلے میں بہترین افسانہ لکھنے پر پہلا انعام ملا ہے"۔

وہ مجھے مرغوب نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

"آپ تو چھپے رستم نکلے مسٹر ہاشمی! اپنی ادبی خوبیوں کا تذکرہ پہلے تو آپ نے کبھی نہیں کیا"۔

"دراصل بات یہ ہے کہ مجھے خود نمائی سے بے حد نفرت ہے"۔ میں نے اپنے الفاظ پر زور دیکر تصنع چھپاتے ہوئے کہا۔ "اور پھر یہ بھی تو کوئی ایسی اچھی بات نہیں۔ کہ میں اپنے افسانے ہر ایک کو دکھاتا پھروں"۔

"خیر آج تو آپ نے اپنا راز خود ہی کھول دیا۔ کسی دن اپنی کوئی بہترین کہانی مجھے بھی دکھایئے نا"۔

اس نے یہ الفاظ کہے اور میں ٹھٹکا۔ کوئی بہترین کہانی تو کیا میرے پاس کوئی بدترین کہانی بھی نہیں۔ کوئی ادبی تحریر کہاں سے لاؤنگا۔

"پرانے افسانے پڑھکر آپ کیا لیں گے۔ کوئی نئی چیز شائع ہوئی تو ضرور آپ کو دکھاؤنگا"۔

میں نے بمشکل اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

رات گھر آکر میں دیر تک سوچتا رہا۔ کہ روزا کی اس خواہش کو کیونکر پورا کیا جا سکتا ہے۔ گھنٹوں سوچتا رہا۔ مگر کچھ بھی سمجھ میں نہ آ سکا۔ کہ کہانی کہاں سے لاؤں۔ روزا کا مسکراتا ہوا چہرہ میری آنکھوں کے آگے رقص کرتا رہا۔ اور میں دل ہی دل میں خوش ہوتا رہا۔ جھوٹ کا پول اگر کھل نہ گیا۔ تو زندگی خوب مزے سے گزرے گی۔

روزا آج دن بھر مجھ سے باتیں کرتی رہی۔ گفتگو صرف ادبی موضوعات سے متعلق رہی۔ اسے افسانہ نگاروں سے دیرینہ الفت ہے۔ کاش میں بھی افسانہ نگار ہوتا۔ اور اس کی محبت جیت سکتا۔

روزا اصرار کرتی ہے کہ اپنا کوئی مطبوعہ افسانہ اسے دکھاؤں۔ سوچتا

ہوں افسانہ لاؤں کہاں سے۔ کئی بار میں نے خود لکھنے کی کوشش کی مگر چند لفظوں سے زیادہ کچھ بھی نہ لکھ سکا۔ خیالات منجمد ہو گئے اور خاموش الفاظ میرا منہ چڑانے لگے۔ میں نے غصے میں کاغذ پھاڑ دیا۔ عین اسی وقت روزا کا چہرہ میری آنکھوں کے آگے مسکرانے لگا۔ اور میری روح کی ساری کوفت دور ہو گئی۔

آج دہلی جانے والی ڈاک میں ایک بہت بھاری لفافہ دیکھ کر میں ٹھٹکا۔ وزن کرنے پر معلوم ہوا۔ کہ اس پر ٹکٹ کم لگے ہیں۔ پتہ دیکھا تو لکھا تھا۔

بدست ایڈیٹر صاحب ماہنامہ "نوبہار" دہلی

میں چونکا۔ شاید کوئی افسانہ بھیجا جا رہا ہے۔ کونے میں بھیجنے والے کا نام دیکھا۔ تو میرا خیال اور بھی پختہ ہو گیا۔ کیونکہ یہ وہی نام تھا۔ جس کی تعریف کئی بار روزا نے میرے سامنے کی۔ "اصغر وحید" ہندوستان کا مشہور افسانہ نگار۔ جانے کس لاشعوری جذبے کے تحت میں نے لفافہ ڈسپیچ کرنے کی بجائے اپنے میز کی دراز میں رکھ دیا۔

آج شام روزا سے رخصت ہونے کے بعد جب گھر پہنچا۔ تو میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اضطراری طور پر میں نے لفافہ کھولا۔ اور یہ دیکھ کر میری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی کہ یہ ایک حسین و جمیل افسانہ تھا۔ "دھنک" میں نے ایک ہی نظر میں سارے کا سارا پڑھ ڈالا۔

کاش میں بھی ایسے افسانے لکھ سکتا۔

آج میں نے افسانے کے سارے کردار تبدیل کر دیئے۔ اصغر وحید نے جتنے مشکل الفاظ استعمال کئے تھے۔ ان سب کو آسان لفظوں میں بدل دیا بعض غیر ضروری واقعات کاٹ دیئے۔ اور جب مجھے یقین ہو گیا۔ کہ "دھنک" کی اصل شکل اب پہچانی بھی نہیں جاتی تو عنوان بھی تبدیل کر دیا "قوس قزح" کتنا حسین عنوان ہے۔ ایک کونے میں اصغر وحید کا نام کاٹ کر اپنا نام لکھ دیا۔

م۔ ا۔ بسمل ہاشمی ———— میرا نام کیسا خوبصورت لگ رہا تھا۔ میرا دل خوشی کے جذبات سے معمور ہو گیا۔ اور پھر سارا دن ایک دلکش فلمی گیت گنگناتا رہا۔

دفتر سے نکل کر جب میں اور روزا نشاط باغ پہنچے۔ تو اس نے پھر اصرار کیا۔

"مسٹر ہاشمی آپ اپنا افسانہ کب سنائیں گے مجھے"۔

"کبھی نہیں"۔ میں نے اسے چھیڑا۔ حالانکہ میرا دل چاہتا تھا۔ کہ یہ مزید اصرار کرے اور میں اسے اپنا افسانہ "قوس قزح" سنا ڈالوں۔

"کیوں؟"

میں خاموش رہا۔

"دیکھئے میں ناراض ہو جاؤں گی"۔

ایک قریبی بنچ پر اس نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ اور میں نے جب دیکھا کہ وہ ناراض ہوا چاہتی ہے تو اپنے کوٹ کی جیب سے مسودہ نکالا۔ اور افسانہ اسے سنانے لگا۔ جوں جوں افسانے کے واقعات اسے سناتا جا رہا تھا۔ اس کا رنگ سرخ ہوتا جا رہا تھا۔ اور پھر جب میں نے افسانہ ختم کیا تو بولی۔

"سچ مچ کیا یہ افسانہ آپ ہی نے لکھا ہے"۔

میں ٹھٹکا۔ کہیں یہ جانتی ہی نہ ہو۔ کہ اصل افسانہ اصغر وحید کا ہے۔

"ہاں ہاں۔ میرا ہی تو ہے"۔ میں نے اپنی پریشانی چھپاتے ہوئے کہا۔

"پھر تو آپ نہایت ہونہار افسانہ نویس ہیں مسٹر ہاشمی"۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"مجھے کانٹوں میں کیوں کھینچتی ہیں آپ"۔ میں نے ذرا ہنستے ہوئے کہا۔

"اصغر وحید اور آپ کی تحریر میں مجھے بالکل کوئی فرق نظر نہیں آتا کس رسالے میں آپ اسے بھیج رہے ہیں۔

"تاحال اس کا ابھی کچھ فیصلہ نہیں کیا۔ "آواز" کے ایڈیٹر صاحب کا ایک خط آیا پڑا ہے۔ خیال ہے انہیں کو بھیج دوں"۔

آج میں نے "قوس قزح" ماہنامہ "آواز" میں اشاعت کے لئے بھیج دیا۔

"آواز" کے ایڈیٹر صاحب کا ایک خط موصول ہوا۔ افسانے کی تعریف کرتے ہیں۔ اور تقاضا کرتے ہیں۔ کہ اکتوبر میں شائع ہونے والے خاص نمبر کیلئے اپنا کوئی بہترین افسانہ بھیجوں۔ میں نے یہ خط روزا کو دکھایا۔ اور دیر تک مجھے تعریفی نگاہوں سے دیکھتی رہی۔

آج ایک اور افسانہ ہاتھ لگ گیا، میں نے اسے بھی پہلے ہی کی طرح تبدیل
…ر کے ایک مشہور ماہنامے میں بھیجدیا۔
روزا اب میرے بہت قریب آگئی ہے۔ میں اس کے سینے کا زیر و بم
…پنے دل کے بہت قریب محسوس کرتا ہوں۔ میں نے کئی بار اس کی دراز
…لفوں کے بل گنے ہیں۔ اس کی باتیں مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے جنت
…ی اپسراؤں کی باتیں ہوں۔ زندگی کے یہ دن اے کاش بہت طویل
…ہو جائیں *

"قوس قزح" شائع ہوگیا۔ چھپے ہوئے نام میں اف کتنی کشش ہوتی
…ہے۔ کونے میں جلی حروف میں لکھا ہوا اپنا نام دیکھ کر میرا دل خوشی سے
…معمور ہوگیا۔ جی چاہا مسرت سے جھومنے لگوں۔ روزا نے جب پرچہ دیکھا
…و محبت سے مجھے دیکھنے لگی۔ اور مجھے یوں محسوس ہوا۔ جیسے مقدر کی تحریر
…و میں نے خود اپنے ہاتھوں سے مٹا کر اپنی مرضی کے مطابق دوبارہ لکھ لیا ہے۔
…زندگی کے یہ دن کتنے حسین و جمیل ہیں۔

"آواز" کا یہ پرچہ اگر وحید کے ہاتھ لگ جائے تو ——— ؟
…ج سارا دن اس خیال نے مجھے پریشان کئے رکھا۔ شام کو روزا اور میں تصویر
…محل میں "دھڑکن" دیکھنے چلے گئے۔ اور طبیعت کی ساری کوفت دور ہوگئی *
چوری کا راز کھل ہی نہ جائے کہیں۔ جانے یہ خیال اکثر مجھے کیوں
…پریشان کر دیتا ہے۔

"زندگی کے زاویے" "گلفشاں" میں شائع ہوگیا۔
اور اب دوسرے چوتھے ایک آدھا افسانہ ہاتھ لگ جاتا ہے۔ مناسب
…تبدیلیاں کر کے رسالوں کو بھیج دیتا ہوں۔ ادبی دنیا میں میرا نام اب گونج
…رہا ہے۔ مدیرانِ جرائد میرے افسانوں کیلئے چشم براہ رہتے ہیں۔ قارئین کے تعریفی
…خطوں کے کئی پلندے میرے پاس جمع ہو گئے ہیں۔ اور سب سے بڑی بات
…یہ ہے کہ میں نے روزا کی محبت کو جیت لیا ہے۔ آفس کے تمام کلرک
مجھے جب اس سے مسکرا مسکرا کر باتیں کرتا ہوا دیکھتے ہیں۔ تو حسد سے
…جل جاتے ہیں۔ مجھے تیز آنکھوں سے گھورتے ہیں۔ لیکن میں ان کی پروا کئے
…بغیر ہی روزا سے باتیں کرنے لگتا ہوں۔

آج اصغر وحید کا ایک اور افسانہ مل گیا۔ اور میں نے بدستور سابق عنوان
تبدیل کر کے "آواز" میں اشاعت کے لئے بھیجدیا۔ وحید اب منتظر ہو گا۔
کہ میرا افسانہ کب شائع ہوتا ہے ——— بے چارہ انتظار ہی کرتا رہیگا
اور افسانہ چھپ جائیگا۔ میرے نام سے ——— اف کتنا دلچسپ
رومان ہے۔

ڈاک خانے کی ملازمت بھی کتنی اچھی ہے۔ پڑھنے کیلئے رسالے
مفت اور شہرت حاصل کرنے کیلئے مضامین بغیر معاوضہ ہی مل جاتے
ہیں۔ اس جھوٹی شہرت کا پول کہیں کھل ہی نہ جائے۔

"آواز" میں میرا افسانہ "حیات" ایڈیٹر کے تعریفی نوٹ کے ساتھ
شائع ہوگیا۔

آج میں نے روزا سے باتوں باتوں میں شادی کا تذکرہ کیا۔ اور یہ سن کر
میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ وہ شادی کی تمام قیود سے آزاد رہ کر زندگی
گزارنا چاہتی ہے۔ میں نے اپنا سارا زورِ بیان صرف کر کے بالآخر اسے
قائل کر ہی لیا۔ کہ شادی واقعی انسانی زندگی کا ایک حسین باب ہے۔
اور شادی کے بغیر نہ مرد کی زندگی خوشگوار بن سکتی ہے۔ نہ عورت کی۔

میں نے باتوں باتوں میں اشارۃً آج روزا سے کہا۔ اگر ہم زندگی
کی شاہراہ پر اس طرح ہاتھ میں ہاتھ ڈالے چلتے جائیں۔ تو ممکن ہے۔ کہ
وہ دشوار گزار سفر جو ہمیں اس جہان میں طے کرنا ہے۔ آسانی سے ختم ہو جائے۔
اس نے میری اس بات پر برا نہیں مانا۔ شاید مستقبل قریب میں ہم دونوں
دائمی رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو جائیں۔

مدیر "آواز" کا ایک خط موصول ہوا۔ لکھتے ہیں۔
"معلوم ہوا ہے کہ افسانہ "حیات" جو آپ کے نام سے "آواز" کی گذشتہ
اشاعت میں شائع ہوا ہے۔ اصل میں آپ کا نہیں بلکہ اصغر وحید کا ہے۔
گو ہمیں آپ پر کسی ادبی سرقے کا شک تو نہیں۔ پھر بھی ہماری تسلی کے لئے
اس کا جواب دے دیجئے گا۔ ورنہ بصورتِ دیگر ہم مجبور ہوں گے۔ کہ آئندہ
شمارے میں اس امر کا تردیدی اعلان شائع کر دیں۔"

میرا دل کسی اندرونی اذیت کی وجہ سے بیٹھنے لگا۔ آغاز جس قدر حسین
تھا۔ انجام اسی قدر تاریک اور بھیانک نظر آ رہا ہے۔ اگر مدیر "آواز" میرے
خلاف نوٹ شائع کر دیں۔ تو ——— !

میں نے مدیر "آواز" سے آج ذاتی طور پر ملاقات کی۔ اور انہیں تمام
حالات بے کم و کاست سنا دئے۔ ایڈیٹر صاحب تشویش زدہ سے ہو گئے

اور کہنے لگے۔ یہ چوریاں کسی طرح بھی چھپائی نہیں جا سکتیں۔ میں نے مزید اصرار کرتے ہوئے کہا۔ آپ تردیدی نوٹ تو شائع نہ کیجئے۔ اس پر وہ کچھ ہچکچائے تو سہی۔ لیکن جب میں نے اُن کی مٹھی گرم کر دی۔ تو مسکرانے لگے۔

اصغر وجید کا وہی افسانہ "انگڑائیاں" کے عنوان سے ایک مقامی پرچے میں شائع ہو گیا۔ اور میری روح پر ایک بہت بھاری بوجھ آ گرا۔ اگر یہی افسانہ روزا دیکھ لے تو ـــــ میری پریشانیاں بڑھتی جا رہی ہیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔ خودکشی کر لوں، موت کو بلا لوں۔ یا اس فضا کو چھوڑ کر دور کہیں بھاگ جاؤں۔

آخر وہی ہوا۔ جس کا مجھے خطرہ تھا۔ صبح روزا کے ہاتھ میں وہی رسالہ دیکھ کر میں ٹھٹکا۔ وہ مسکراتی ہوئی میرے پہلو میں آ کھڑی ہوئی۔ میں سامنے درختوں کے پتوں کو دیکھنے لگا۔ اس نے میرے چہرے پر نگاہیں گاڑتے ہوئے کہا۔

"مسٹر ہاشمی یہ افسانہ کیا آپ کا ہے؟"

میرا رنگ زرد ہو گیا۔ جواب میں میرے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا۔ روزا بڑبڑاتی ہوئی پرے جا کھڑی ہوئی۔

"یہ آپ نے ادبی چوریوں کا سلسلہ کب سے شروع کر رکھا ہے مسٹر ہاشمی"۔

"ادبی چوریاں" مجھے یوں محسوس ہوا۔ جیسے کسی نے پگھلا ہوا سیسہ میرے کانوں میں انڈیل دیا ہو۔ روزا نے مجھے ایک بار تیز نگاہوں سے نفرت سے دیکھا۔ اور کمرے میں چلی گئی ـــــ اف ـــــ میری زندگی کے تمام دلکش نقوش اچانک مٹ گئے ـــــ میری ساری کائنات اُجڑ گئی۔

آج سارا دن روزا منہ پھر سے مسکرا مسکرا کر باتیں کرتی رہی۔ اور میرے سینے پر سانپ لوٹتے رہے۔

مدیر "آواز" نے تردیدی نوٹ شائع کر دیا۔ اور میری ساری ادبی زندگی کا خاتمہ ہو گیا۔

کاش میں خودکشی کر سکتا۔

غزل

از جناب اسعد شاہجہانپوری

دُور تر ہوتے ہو تُم، نزدیک تر پاتا ہُوں مَیں
کھینچتے ہو آپ کو لیکن کھچا جاتا ہُوں مَیں

آج ہر ہر موج سے قسمت کو ٹکراتا ہُوں مَیں
اپنی کشتی جانبِ ساحل لئے جاتا ہُوں مَیں

آگے دردِ عشق کی حد سے بڑھا جاتا ہُوں مَیں
"ملتفت" ہوتا ہے کوئی جی میں شرماتا ہُوں مَیں

ہے وہی معراجِ حسن و عشق کی منزل "کہ جب
درد بن جاتے ہو تم، تاثیر بن جاتا ہُوں مَیں"

آج یارب لے چلی ہیں کس طرف سرمستیاں
چومتا ہوں پائے ساقی جھومتا جاتا ہُوں مَیں

کم نہیں ہستی ہے "گم ہونے پہ بھی قیدِ حیات
ہر نفس کو ایک زنجیرِ گراں پاتا ہُوں مَیں"

نزع میں پڑتی ہے سو سو یاس سے اُن پر نظر
آج پھر اپنی حدیثِ شوق دہراتا ہُوں مَیں

ہاں سنبھل بیٹھو، دکھاتا ہے تخیّل آئنہ
میں حجابِ درمیاں ہوں لو اُٹھا جاتا ہوں مَیں

مے سے نفرت ہے مگر اسعد فلک کو کیا کہوں
دل کو دیتا ہوں تسلّی غم کو بہلاتا ہوں مَیں

افسانہ

از

جنابِ مرزا فدا علی خنجرؔ لکھنوی

میری ولادت اکتوبر ۱۸۹۸ء میں ہوئی۔ والد کا نام مرزا علی محمد عرف منے آغا ابن مرزا یحییٰ علیخاں تھا۔ لفظ "خان" شاہی خطاب ہے جو ناموں
کے ساتھ شریک رہتا تھا۔ بزرگوں کا وطن سبزوار ہے۔ چونکہ اسلاف کے کارنامے اُن کے ساتھ ہی گزر ہو چکے ہیں۔ اس لئے اُن کا تذکرہ
چنداں ضروری نہیں۔

بچپن ہی میں باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ پھوپھی کی آغوشِ محبت میں تربیت و پرورش پائی۔ ۱۵، ۱۶ سال کی عمر میں ذوقِ ادب پیدا ہوا۔
۱۹۰۹ء میں پہلا ناول شائع ہوا۔ اس کے بعد سے سیکڑوں ناول تصنیف، تالیف اور ترجمہ کئے۔ بعض مقبول اور بعض کس مپرسی کا
شکار ہوئے، افسانوں کا رواج ہوا۔ تو ناولوں کا سلسلہ کم ہو گیا۔

اب تک بمبئی، لاہور، الہ آباد سے چھ مجموعے طبع ہو کر منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔ اور چند مجموعے طباعت کے منتظر ہیں۔
صحت کی خرابیاں ابتدا سے ساتھ تھیں اور شاید انتہا تک حقوقِ رفاقت ادا کرتی رہیں۔

خنجرؔ

بنتِ عجلان نے انصار کی بھری محفل میں داخل ہو کر نیم عریاں رقص کا
مظاہرہ کرتے ہوئے غیور نوجوانوں کے باحمیت لہو میں قیامت خیز ہیجان برپا
کر دیا۔ مالک بن عجلان بہن کی حیا سوز حرکت کا متحمل نہ ہو سکا، غیظ و غضب سے
دونوں آنکھیں شعلہ فشاں ہو گئیں، نتھنے پھول کر پھڑکنے لگے۔ اور لبوں پر کف
کی نمود تلبی غضبناکیوں کی نمائش میں مصروف ہو گئی۔ حتیٰ کہ عربی تیغہ سونت کر
شیرانہ نعرہ کے ساتھ اُٹھ کھڑا ہوا۔ قریب تر تھا۔ کہ شمشیر آبدار کی بے پناہ ضرب
بزمِ عالم سے ایک حسین وجود کا صفایا کر دے۔ کہ حاضرین محفل سے چند عافیت
جُو اصحاب جھپٹ کر دونوں کے درمیان حائل ہو گئے۔ اور یوں شمعِ حُسن و جمال
گُل ہونے سے محفوظ رہی۔

ان ناخوشگوار حالات نے بنتِ عجلان کو ذرا بھی متاثر نہیں کیا، وہ کمال
بے خوفی سے مرمریں بت بنی کھڑی رہی سیاہ دراز کاکلیں جمیل ناگنوں کے مانند
اُبھرے اُبھرے سینے پر بل کھاتی رہیں، سحر ساز ناوک فگن آنکھیں غیرت دار بھائی
کے غضب آلود پیکر پر طنزیہ تبسم کی بارش میں سرگرم رہیں۔ حالانکہ اس انقلابی
حادثہ نے بزمِ طرب کی نشاط آفرینیوں میں انجمادی کیفیت پیدا کرتے ہوئے دم
سرور دینے والوں کو سراپا سکوت بنا دیا۔ اور ان میں اتنی بھی صلاحیت نہ چھوڑی
کہ واقعے کی نوعیت پر سنجیدگی سے تبصرہ کر سکتے۔

کافی عرصے تک اربابِ سرور کے لبوں پر مہرِ سکوت ثبت رہی، نغمہ و سرود
کی ہنگامہ آرائیاں سکوت و جمود کی آداسیوں میں گم رہیں، دفعتہً نوائے خاطر نشیں
سے فضا گونج اُٹھی۔ یعنی بنتِ عجلان نے مترنم لب و لہجہ اور دل پذیر انداز سے
کہنا شروع کیا۔ "ذی شرف گروہِ انصار! آج تمہیں ایک غیر متوقع عمل نے
آپے سے بے آپے کر رکھا ہے۔ آنکھیں انگاروں کی طرح لال اور شرر بار ہو
رہی ہیں، تلواریں نیاموں سے نکل پڑنے کو بجلی کی صورت تڑپ رہی ہیں، کیوں
صرف اس واسطے کہ شیخ قبیلہ کی بے باک دختر محفلِ انبساط میں بے مقنع
و چادر رقص کرنے آ گئی ہے، اُس کا سر کھلا اور ساقِ پا بے حجاب ہیں! تم
اس بے شرمی، حیا سوزی اور ناموسی کے متحمل نہیں محض اس لیے رسوا کن
شخصیت کا خاتمہ کرتے ہوئے طبعی غیرت و حمیت کی نمائش کرنا چاہتے ہو!

بے شک یہ مردانہ جذبہ، یہ شریفانہ عزم سراہے جانے کے قابل تھا۔ اگر اب سے پہلے ظاہر ہوا ہوتا۔ مجھے افسوس ہے کہ ناوقت جوش و خروش اور بے محل ہمہمہ کی داد و ستائش سے قطعاً قاصر ہوں! میں نے تو اس عظیم ترین حادثے کا نا مکمل نمونہ پیش کر دیا ہے جو آج ہی غروبِ شمس کے بعد رونما ہو کر بنو قحطان کی قومی خودداریوں کا شیرازہ منتشر کر دے گا۔ اُن کا دامنِ ناموس دائمی طور سے داغدار ہو جائیگا۔ اور وہ پھر کبھی فخر و مباہات کا حوصلہ نہ کر سکیں گے۔

وہ مسعود ہنگام قریب سے قریب تر ہے۔ کہ ہوس کار فیطون کے فرستادہ خدام نازل ہو کر مجھے میرے شوہر کی خدمت میں پہنچانے کے بدلے ایسے مقتلِ عصمت و ناموس میں پیش کر دیں۔ جہاں اب سے قبل نمعلوم کتنی بے نصیب دوشیزاؤں کی عزت و آبرو زانی بادشاہ کی ہوسناکیوں پر قربان ہو چکی ہے اور عالم الغیب ہی بہتر جانتا ہے کہ آنے والے زمانے میں کتنی باکرہ لڑکیوں کا بکر بوالہوسی کے دیو پر بھینٹ چڑھے گا! اس لئے ——— صرف اس لئے مناسب ہے۔ کہ تمہاری تشنۂ خوں تلواریں میرے جوان لہو میں غسل کرتے ہوئے کالبدِ خاکی کو لقمۂ گور بنا دیں اور میں رسوائی کی معیبت سے مامون رہوں ——— ہاں انصاری بہادرو بڑھو اور اس بے شرم لڑکی کے ٹکڑے اُڑا دو۔ جس نے تمہاری آبروریزی کا اقدام کیا ہے، جس نے خاندانی لاج برباد کی ہے۔ اور جس نے سردارِ قبیلہ کا سر نیچا کر دیا ہے یا پھر اس انسانیت سوز فرمان اور فرمان نافذ کرنے والے کے خلاف بغاوت کا اعلان کر دو۔ جس کے باعث سارے قبیلے کی توہین ہو رہی ہے، جو معصوم و باحمیت کنواریوں کو نامحرم کے ہاتھوں کی کٹ پتلی بننے پر مجبور کرتا ہے۔ بڑھو، غیور انصاریو! بڑھو، تلواریں علم کر لو، نیاموں کو توڑ پھینکو، غلامی کی زنجیروں سے آزاد ہو جاؤ اور اخلاف کے واسطے ضیغمانہ کارنامے چھوڑ جاؤ۔ کہ اُن پر آنے والی نسلیں فخر و مباہات کے ترانے الاپ سکیں۔"

بنتِ عجلان کی تقریر نے حاضرین میں قیامت کا جوش و خروش پیدا کر دیا انصار کی آبدار تلواریں نیاموں سے باہر نکل پڑیں، نوجوانوں نے بلند بانگ بغاوت کا اعلان جاری کر دیا۔ لیکن معمر و سنجیدہ اشخاص واقف تھے کہ اُن کے کمزور بازوؤں میں حکومت کا تختہ الٹ دینے کی قدرت موجود نہیں، اُنہیں پہلا ہی تصادم فنا کے گھاٹ اتار سکتا ہے۔ جذبات سے کام لے کر وہ پہلے سے زیادہ ذلیل و خوار ہو جائیں گے۔ دور اندیشی کے خیال نے مجبور کیا۔ کہ نوجوانوں کی گرم جوشیوں کو نصیحت کے چھینٹوں سے سرد کرتے ہوئے حکمت عملی سے کام نکالیں۔ اُنہوں نے کمال کد و کاوش سے اُبھرے ہوئے جذباتِ غضب کو معتدل کرنے میں کامیابی حاصل کی اور ایک مختصر سے حجرے میں مخصوصین کی مجلسِ شوریٰ منعقد کرتے ہوئے غور و خوص شروع کر دیا۔

سوادِ مدینہ پر لیلائے شب کے مشکفام گیسوؤں کا بکھرنا تھا۔ کہ فیطون کا شاہی ایوان کافوری شمعوں اور زیتون کے تیل سے روشن ہونے والے جھاڑوں، کنولوں نیز مرونگوں کی جھلملاتی روشنیوں سے شجر طور کے مانند جگمگا اُٹھا۔ بیرونی خلوت سرا آرائشی سامانوں سے سج سجا کر عروسِ شبِ اول بن گئی۔ نقرئی مجمروں سے عود و عنبر کی مشام نواز لپٹیں بلند ہو ہو کر فضا کو معنبر کرنے لگیں۔ پھولوں کی عطر بیز مہک میں ڈوبا ہوا چھپر کھٹ کسی نوبہار نازک کی پذیرائی کے لئے دیدۂ منتظر بن گیا!

فیطون نے بھی اول شام بالمرہ فرائض سے فراغت کر لی۔ آج وہ ناز آفریں حرموں سے بغل گیر ہونے کے بجائے بیرونی عشرت کدے میں رونق افروز ہو گیا۔ کیونکہ اسے انتظار تھا ——— ایک ایسے غنچۂ نودمیدہ کا انتظار جس نے بادۂ شباب کی کیفیتوں سے سرشار ہو کر شگفتگی حاصل کرنے کو پنکھڑیوں کی گرفت ڈھیلی کرتے ہوئے گل نورس بن جانے کا عزم مصمم کر لیا ہو۔ یہ اتفاق ہے کہ آج سے قبل بھی اسی مقتلِ عصمت و آبرو میں غیر اسرائیلی لڑکیوں کو حکومت وقت کے جابرانہ فرمان پر عزیز از جان بکر قربان کر دینا پڑا تھا۔ اب سے پیش تر بھی فیطون کی ہوس کاریوں نے موسمِ بہار کے دیوانہ بھونرے کی طرح معصوم کنواریوں کا رس لے لے کر خواہشاتِ حیوانیہ کی تسکین و تسلی کا مواد فراہم کیا تھا لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ ان جملہ شکارِ ہوس ہونے والی لڑکیوں میں اس کیف و سرور کا نام و نشان تک موجود نہ تھا۔ ان میں کوئی ذاتی وجاہت یا صفاتی حسن نہ تھا۔ وہ شباب کی پیدا کردہ رنگینیوں کے سوا ہر فخر و کمال سے تہی دست تھیں۔ اُن کے برعکس آج اُس کی بوالہوسی کا شکار ہونے والی مہ پارہ قبیلۂ بنو قحطان کے شیخ اعظم کی گل اندام و پری جمال دختر اور موجودہ رئیس کی نیک نہاد و مریم خصال بہن تھی۔ جو شمعِ شبستان و زینتِ آغوش بننے کو لائی جا رہی تھی۔

اُس نے حاشیہ نشینوں کی زبانی بنت عجلان کے جمالِ زہد شکن کی بیشمار
ستانیں سنی تھیں لسے باور کرایا گیا تھا۔ کہ مالک کی بہن کا رخِ روشن مہر وماہ
چشمک زن ہے' اس کا سڈول جسم مینائے احمریں کی صورت نظر رباہے جو
ہبائے جوانی کی سرمستیوں سے معمور نظر آتا ہے' اس کی سحر ساز آنکھیں دیدۂ
زال کی طرح مئے بار ہیں اور ناوک فگنی کے فن میں مشّاقِ کامل! لاشعوری
ں حالت ہیں ان سے جو بے پناہ سوفار سر ہوتے رہتے ہیں مجال کیا ہے کہ ان
ی زد میں آیا ہوا کوئی قلب سلامت رہ سکے۔ اس کی مترنم آواز لحنِ داؤدی
ے مانند دلکش ہے' کوئی شعر گنگناتی ہے تو ہوائیں تک سرخوشی کے عالم میں
جھومنے لگتی ہیں وغیرہ۔

یہی وہ سُنے سُنائے اوصاف وخصائل تھے جن کی کیف ازائیوں نے اُسے
سر سے قدم تک چشم مشتاق بنا رکھا تھا' وہ اس کی تقریب کتخدائی کو حسن اتفاق
پر محمول کرتے ہوئے مسرور تھا کیونکہ اسی حیلے سے وہ شاہی خلوت گاہ میں
داخل کی جاسکتی تھی۔ وقت کے ساتھ ساتھ انتظار کی سختیوں میں اضافہ
ہو رہا تھا۔ یہ تو یقین تھا کہ انصار کے نحیف و ناتوان بازوؤں میں اتنا کس بل
کہاں جو سلطانی سپاہیوں سے نبرد آزمائی کر سکیں۔ البتہ فرستادہ غلاموں
کی تغافل کیشی موجبِ برہمی ہو رہی تھی۔ کہ وہ فرض کی بجا آوری میں تاخیر کا
ارتکاب کرتے ہوئے قیمتی لمحات ضائع و برباد کر رہے ہیں! حریصِ دیدار
نگاہیں بار بار در پر جا لگتیں' کبھی کبھی ہوا کی سرسراہٹ پر آہٹ کا گمان کرتے
ہوئے غیر ارادی عنوان سے در تک جا پہنچتا۔ پھر غلط فہمی سے نادم ہوتا ہوا
واپس آجاتا۔ اسی کشاکش شوق و التہاب میں وقت ختم ہو رہا تھا۔ یکایک
انتظار کی سخت و صعب ساعتیں گذر کر مقصد برآری کا روح نواز ہنگام ختم ہوا۔
در کے حریری پردے کو لطف آفریں جنبش ہوئی۔ اور زریں کمر حبشی غلام نے
اندر داخل ہو کر مؤدبانہ مجرا عرض کیا۔ پھر دست بستہ استادہ ہو گیا۔

"کیا ہے؟" فیطون نے دبدبہ آمیز انداز سے سوال کیا۔ حالانکہ غلام کی
حاضر باشی کے مطلب سے مطلع ہو چکا تھا۔ اور قلبی اشتیاق تھا کہ خسروانہ رکھ
رکھاؤ کو طاقِ نسیان کا گلدستہ بناتے ہوئے پیکرِ طناز کی پذیرائی کو جھپٹ
پڑے۔

غلام نے دوبارہ ادب آموز عنوان سے کچھ خم ہو کر التماس کی "مالک
بنِ عجلان کی حور لقا بہن اذنِ پابوسی کی آرزومند ہے"۔

"حاضر کرو" فیطون نے متکبرانہ شان قائم رکھنے کی سعی کرتے ہوئے حکم
دیا۔ غلام نے سینے پر ہاتھ رکھ کر جھکتے ہوئے فرمانبرداری کا اعلان کیا پھر
اُلٹے پاؤں واپس ہو گیا۔ فیطون کے دل کی حرکت تیز سے تیز تر ہو گئی۔ ضبط
کرنے کے باوجود بھی نچلا بیٹھا نہ گیا۔ اُٹھ کر بے تابانہ چہل قدمی میں معروف
ہو گیا۔ چند ثانیہ گزرنے پر ریشمی پردہ بلند ہوا۔ اور حبشی غلام کی معیت میں
کشیدہ قامت چھریرے بدن کا مجسمہ سر سے ناخنِ پا تک سیاہ برقع میں
مستور شاہی خواب گاہ میں داخل ہو کر خاموش کھڑا ہو گیا۔

فیطون کی بیقراریاں ترقی پذیر ہو گئیں۔ ٹہلتے ٹہلتے اس طرح رُکا جیسے
زمین نے پاؤں پکڑ لئے ہوں۔ پھر للچائی ہوئی حریص نگاہوں سے برقع پوش
کو تاکتے ہوئے غلام سے متوجہ ہوا —— "شاباش! تم اپنے مفروضہ
سے فارغ ہو گئے' جاؤ' صدر پھاٹک پر ٹھہر کر فرمانِ ثانی کا انتظار کرو
—— حجرے کے نزدیک قیام کی ضرورت نہیں۔ تعمیل امر سے
سرتابی کرنے کا انجام تم کو معلوم ہے"۔

غلام نے سزا کے ہیبت ناک تصور سے تھرتھراتے ہوئے آداب خادمانہ
عرض کیا اور چپ چاپ واپس ہو گیا۔ دراصل فیطون کو گوارا نہ تھا۔ کہ اس کے
اور بنت عجلان کے مابین ہونے والے مکالمے کی بھنک کسی تیسرے شخص کا آویزۂ
گوش بنے۔ کیونکہ اس وقت وہ ہمیشہ کے مانند ارادہ پرست و جابر حکمران کی طرح
فرمانوں کی تعمیل کرانا پسند نہیں کرتا تھا۔ بلکہ عاشقِ بے تاب کی صورت و التجائیں
التجائیں بروئے کار لاکر پرستاری و ناز برداری کے مظاہرات کا خواہشمند
تھا!

برقع پوش' آبنوسی مجسمے کی طرح ساکت و صامت ایک جگہ قائم
تھا۔ فیطون بھی گفتگو آغاز کرنے کا پہلو تلاش کر رہا تھا۔ حجرے میں مستقل خاموشی
طاری تھی اور بجز دو جانداروں کے تنفس کی دھیمی صدا کے فضا کو مرتعش کرنے
والی آواز موجود نہ تھی۔ ایک لمحہ' دو لمحے حتیٰ کہ کئی لمحات سکوت و جمود
کی نذر ہو گئے۔ آخر فیطون کے قدم متحرک ہوئے۔ وہ دو تین گام بڑھ کر برقع
پوش کے مقابل جا کھڑا ہوا۔ سر سے پاؤں تک متجسسانہ نظر سے دیکھا اور
گویا ہوا۔ "خوش آمدید' ملکہ حسن و رعنائی! خوش آمدید۔ کس قدر مبارک
و مسعود ہے یہ ہنگام اور کیسا ہمایوں ہے یہ کاشانہ کہ تمہارے یمنِ قدم سے
رشکِ فردوس ہو رہا ہے! بڑھو بڑھو اور فرماں روائے حجاز ——

نہیں نہیں۔ ایک پرستار محبت، ایک شہید لئے بیقرار کے آغوشِ شوق میں سما جاؤ! میں، یہ عشرت کدہ اور اس کی تمام انبساط آگیں فضائیں تمہارے خیر مقدم کو بازو کشادہ ہیں ——— میں حکم صادر کرتے ہوئے توہینِ حُسن کا مرتکب ہونا گوارا نہیں کرتا۔ بلکہ ایک بندۂ حسن ——— ایک نیاز کیش کی حیثیت سے التجا پیش کرتا ہوں کہ چکور کو چاندنی اور پروانہ جانسوز کو شمع حسن کی جگمگاہٹوں سے محروم نہ رکھتے ہوئے روئے نظارہ فروز کو اس منحوس سیاہ نقاب سے آزاد کر دو اور تشنۂ دیدار آنکھوں کو شعلۂ طور کی تجلیوں سے منوّر بنا دو"۔ چند ثانیہ انتظار کرنے کے بعد پھر کہنا شروع کیا۔" میری عاجزانہ التجاؤں پر توجہ مرکوز نہیں ہوئی! مگر ——— مگر میرے نحیف و ناتوان ہاتھوں سے صبر و تحمل کا دامن چھوٹ رہا ہے ہیں یہ نامسعود برقع جو لکّۂ ابر کے مانند ماہتاب کو مخفی کئے ہے۔ دیر تک برداشت نہیں کر سکتا ——— میں اس نقاب کو نوچ کر روئے زیبا سے جدا کر دینا چاہتا ہوں جو بد بخت رقیب بن کر قلب مشتاق کو مجروح کر رہی ہے۔"

فیلطون کی تقریر ناتمام رہ گئی۔ مجسّمہ کو جنبش ہوئی اور چشم زدن میں برقع مع نقاب پیکر سے جدا ہو کر فرش پر آ رہا۔ فیلطون کو ایسا محسوس ہوا جیسے دفعتہً ہزاروں صاعقے چمکتے ہوئے اُس پر آ گرے! وہ سکتے کے عالم میں بت بن کر رہ گیا! خوف و سراسیمگی کی حالت میں زبان پر جاری ہو گیا۔ "کون ، مالک بن عجلان !"

"ہاں مالک بن عجلان ہی ہوں!" مالک نے فرطِ غضب سے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔" تیری آنکھیں دھوکا نہیں دے رہی ہیں۔ سن ——— غور سے سُن! تیرے جابرانہ احکام بنو قحطان کے غیور سردار کا غرورِ شرافت فنا نہیں کر سکتے۔ بنتِ عجلان کا دامنِ ناموس پاک تھا۔ پاک ہے اور ہمیشہ پاک رہے گا۔ تجھ سے ناپاک کتوں کا ہاتھ وہاں تک نہیں پہنچ سکتا جس خلوت کدے میں تُو کتنی ہی پاکباز و مظلوم عروسوں کا نازِ دوشیزگی خاک آلود کرتے ہوئے حظوظِ نفس حاصل کر چکا ہے۔ آج اور اسی وقت وہی عشرت خانہ تیری آرزوؤں، تمناؤں اور زندگی کا مقتل بنے گا ——— خبردار جو منہ سے آواز نکالی۔ مالک کی موت سے پہلے تجھے جہنم واصل ہونا ناگزیر ہے ——— کانپ رہا ہے! کمزور اور بے بس لڑکیوں پر ستم توڑتے وقت ہراساں نہیں ہوا، اب موت کا جبڑا کھلا دیکھ کر بدحواس ہو رہا ہے! لیکن خوف و ہراس سے جاں بری محال ہے جس طرح اکثر دوشیزاؤں سے پہلو آباد کر کے دل شاد ہوتا تھا۔ آج مالک کی تیغ جوہر دار کو بھی پہلو میں جگہ دے کر سرورِ نفس حاصل کر!"

جملہ تمام ہوتے ہی مالک کا ہاتھ بلند ہوا۔ فضا میں بجلی چمکی۔ گری اور فیلطون سہمی ہوئی چیخ کے ساتھ فرش پر جیتے جیتے لہو میں لوٹتا نظر آیا ؛

"تم پر کیا مصیبت نازل ہوئی جو صعوبات سفر برداشت کرتے ہوئے یہاں حاضر ہوئے اور مجھ سے کس چیز کے خواہشمند ہو؟"

مملکتِ شام کے ذی اقتدار غسّانی بادشاہ ابو جلیلہ کی رعب دار آواز بلند ہوتے ہی اراکین دربار کی متجسّس نگاہیں حلقۂ چشم سے نکل نکل کر اُن بے نصیب آوارہ وطنوں کی مغموم صورتوں پر مرکوز ہو گئیں۔ جنہیں خدام سلطانی نے کمال خستگی اور شکستہ خاطری کی حالت میں ابو جلیلہ کے حضور میں پیش کیا تھا۔ وہ سراسیمہ و مضطر، حیران و پریشان ارض حجاز سے فرار ہو کر چھپتے چھپاتے سرزمینِ شام پر وارد ہوئے تھے۔

ابو جلیلہ کے دریافت کرنے پر فریادیوں کے قافلہ سالار مالک بن عجلان نے سامنے حاضر ہو کر سجدۂ احترام ادا کرنے کے بعد مؤدبانہ لب کشائی کی "عالی جاہا! ہم لوگ قبیلۂ بنو قحطان کے افراد اور یمن کے باشندے ہیں جب سیل عرم کی تباہ کاریوں نے بے خانماں کر دیا۔ تو ہمارے دو بزرگ اَوس و خزرج نے مدینہ آ کر پناہ لی۔ وہاں بنو قریظہ اور بنو نضیر برسر اقتدار تھے۔ گمان تھا کہ یہ قبائل بحسن سلوک پیش آئینگے اور ہمیں ان کے زیر سایہ امن و عافیت نصیب ہو گی۔ لیکن تجربے نے اس کے مخالف صورت پیش کی! اُنہوں نے رحم و مراعات کے بدلے بھاری بھاری محاصل عائد کرنا جاری کر دیا، وہ آزادی جو ہر جاندار کا فطری حق ہے سلب کر لی اور غلاموں کی سی زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیا!"

"اور بنو قحطان نے یہ ناروا سلوک گوارا کر لیا!" ابو جلیلہ نے تیوروں پر بل ڈالتے ہوئے دریافت کیا۔

"ہم غیر منصفانہ سختیاں گوارا کرنے پر مجبور تھے"۔ مالک بن عجلان نے بے بسی کا اظہار کرتے ہوئے بتایا۔" ہمارے ناتواں بازوؤں میں اتنی

طاقت نہ تھی کہ وہ دست بقبضہ ہو کر مقابلہ کر سکتے۔ سیل عرم نے قبیلے کے اکثر جواں مردوں کو فنا کے گھاٹ اتار دیا تھا جو افراد کسی نہ کسی طرح بچ رہے تھے وہ بھی گردش روزگار سے جھاڑو کے تنکوں کی طرح منتشر ہو چکے تھے۔ اور بدحالی و کس مپرسی کے سوا ہمارا کوئی حلیف موجود نہ تھا۔

"پھر اب ان مظالم کے خلاف واویلا مچانے کا سبب کیا ہے؟"
ابو جبلیہ نے تحقیق چاہی۔

"فیطون کا جبر و استبداد حد اعتدال سے بہت کچھ تجاوز کر چکا ہے" مالک بن عجلان نے دردناک و اندوہ گیں لب و لہجہ میں عرض کی۔ "اس نے ہماری توہین و تذلیل کے سلسلے میں عبرتناک اقدام کرتے ہوئے فرمان جاری کیا ہے کہ اسرائیلی لڑکیوں کے سوا ہر کتخدا ہونے والی دوشیزہ عروسی کی پہلی رات اس کی شبستان عشرت میں گزارنے کے بعد اپنے شوہر کے گھر جا سکتی ہے اور شاہی حکم کی خلاف ورزی کرنے کی سزا موت قرار دی ہے!"

"ٹھہرو" ابو جبلیہ نے غضبناک لہجے میں ڈپٹتے ہوئے حکم دیا۔ اس کی دونوں آنکھیں سرخ و شعلہ فشاں ہو گئیں، جذبات غضب کی فراوانی سے سے چہرہ تمتما اٹھا۔ سارا جسم تھر تھرانے لگا۔ غیر معمولی برہمی سے خائف ہو کر تمام درباری دم بخود ہو گئے اور مالک بن عجلان کے لبوں پر مہر خاموشی ثبت ہو گئی۔

چند لمحے تامل کرنے کے بعد تند و تلخ لہجے میں کہنا جاری کیا "کیا مدینہ کے بسنے والے قبائل جذبۂ خودداری سے محروم ہو چکے ہیں، کیا ان کی آبدار تلواروں کو مورچہ لگ گیا ہے یا حجازی جوانوں کا خون منجمد ہو چکا ہے۔ جو وحشیانہ احکام کے خلاف قدم اٹھانے کی جرأت نہیں کر سکتے ——— جو لوگ غیرت و حمیت سے تہی دست ہو چکے ہیں۔ جن لوگوں نے شرافت کی موت پر ذلت کی زندگی کو ترجیح دینا منظور کر لیا ہے۔ جو آزادی و حریت کی نعمتوں سے غلامانہ پابندیوں پر راضی ہیں۔ ان کی دست گیری و امداد نہ کرتے ہوئے ان کے حال پر چھوڑ دینا ہی بہتر ہے"

"عالی جاہا!" مالک بن عجلان نے غلط فہمی دور کرنے کی سعی کرتے ہوئے بیان جاری کیا۔ "محکومانہ زندگی، پُر آفات و مصائب ماحول اور روز افزوں مظالم نے جوشیلے لہو کو کسی قدر سرد و منجمد ضرور کر دیا تھا لیکن قومی حمیت و فطری غیرت سے یکسر عاری بھی نہیں ہو گئے۔ ہنوز ایسے افراد بھی موجود تھے جو ناگفتہ بہ حالتوں کو جانچنے کے ساتھ انتقامی تدبیروں پر غور کر رہے تھے۔ بالآخر وہ اپنی کوششوں میں کامیاب ہوئے اور فیطون اپنے محل کے اندر ہی قتل کر دیا گیا۔"

"مرحبا! مرحبا!" ابو جبلیہ نے خوشنودی کا اظہار کرتے ہوئے دریافت کیا "وہ شریف لوگ کون تھے جنہوں نے ایوان حکومت میں داخل ہو کر جوہر شجاعت کا مظاہرہ کیا؟"

مالک بن عجلان نے کمر سے تیغہ کھول کر پیش کرتے ہوئے عرض کی۔

"عالی جاہا! یہی وہ شمشیر جوہر دار ہے جو فیطون کے ناپاک لہو میں غسل کر کے نکھری ہے!"

"خوب! خوب! یہ واقعہ کس طرح صورت پذیر ہوا؟" ابو جبلیہ نے تلوار کے جوہر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہم لوگوں کے مدینہ چھوڑنے سے قبل بنت عجلان کی تقریب عقد عمل میں آئی" مالک بن عجلان نے واقعہ کی نوعیت پر روشنی ڈالتے ہوئے بیان جاری کیا۔ "عین رخصتی کے محل پر عروس نے بزم طرب میں داخل ہو کر انصار کے جواں مردوں کو شاہی حکم کی جانب متوجہ کیا۔ ہم سب کی جملہ مسرتیں فکر و تشویش سے تبدیل ہو گئیں۔ غیور لہو شرائین کے اندر جوش کھانے لگا۔ اور باہمی مشورے سے ایک رائے قرار پا گئی۔ اس رائے کے مطابق بنت عجلان کی بجائے یہ خادم عروسی لباس سے آراستہ ہو کر فیطون کے شبستان میں داخل ہوا۔ اور وہ جب خواہشات کی تکمیل کے واسطے یہاں آیا تو بیدھڑک لب تشنہ تلوار کی پیاس اس کے گرم گرم لہو سے بجھا۔ اور غرفہ سے فرار ہو کر ان ساتھیوں سے آملا۔ جو منزل ذی حرمین میں پہلے سے میری آمد کے منتظر تھے۔"

"پھر کیا ہوا؟" ابو جبلیہ نے نتیجہ معلوم کرنے کے شوق میں سوال کیا۔

"پھر ——— پھر ہم سب لوگ دن کو قیام اور رات کو سفر کرتے جاسوسوں کی دوربین نگاہوں سے بچتے بچاتے پناہ و استمداد شاہانہ کی توقع میں یہاں حاضر ہو گئے۔ امیدوار ہیں کہ ہمارے ان پس ماندہ لوگوں کی جو بدرجۂ مجبوری حاضر نہ ہو سکے۔ اور فی الحال جابر امرائے بنو قریظہ و بنو نضیر کے مظالم کا شکار ہو رہے ہیں۔ اعانت و دست گیری کی طرف توجہ فرمائی جائے۔"

"ایساہی عمل میں آئیگا" ابو جبلیہ نے امداد دینے کا قول دیا۔ "سردست تم لوگ حکومت کے مہمان کئے جاتے ہو ہفتہ عشرہ بعد شام کا جرار لشکر اسرائیلیوں کی سرکوبی کو روانہ ہوگا۔ اور ظالمین اپنے کردار کی سزا پائیں گے۔"

فریادیوں نے "زندہ باد بادشاہ ابو جبلیہ! پائندہ باد حکومت شام!" کا نعرہ لگایا۔ زمین بوس ہوئے اور حجّاب کی رہنمائی میں مہمان خانے کی سمت روانہ ہو گئے۔

ابو جبلیہ مدینہ کے حالات و واقعات سے متاثر ہو کر قسم کھا بیٹھا کہ "جب تک یہودیوں سے ان کے مظالم کا انتقام نہ لے لیا جائے جملہ عیش و آرام حرام ہے"! اس نے شیشہ و ساغر کو منہ لگانا ترک کر دیا، رقص و سرود کی محفلیں طاق نسیان کی زینت بن گئیں۔ اور شاہی حرموں کی سیجیں سونی سونی دکھائی دینے لگیں! وہ چاہتا تو مملکت شام کی عظیم طاقت کے ساتھ مدینہ پر چڑھائی کر سکتا تھا لیکن غور و فکر کے بغیر کسی طرح کا اقدام دانش مندی و تدبیر کے منافی تھا علانیہ حملہ آور ہونے کی صورت میں یہودیوں کا قلعہ بند ہو جانا یقینی تھا۔ اُسے جاسوسوں کی زبانی اُن کی دولت مندی، خوراک کی بہتات اور قلعوں کے استحکام کا راز دریافت ہو چکا تھا۔ وہ جانتا تھا۔ کہ اس عنوان کی لڑائی طوالت سے خالی نہیں، حریف پر غلبہ حاصل کرنے کو مدت درکار ہوگی اور طویل جنگ کے خارستان میں دامن الجھانا مصلحت کے خلاف تھا۔ نمعلوم کتنی راتوں کی طولانی خلوتوں میں جاگ جاگ کر لڑائی کے نقشے مترتب کرنے اور پھر مسترد کر دینے میں مصروف رہا۔ بالآخر مکر و فریب سے مدعا حاصل کرنے پر عمل کرنا طے کرتے ہوئے سفر حجاز کا عزم کر لیا۔

یہ سفر آہستہ روی و سبک خرامی سے طے ہؤا۔ ہر منزل پر وہاں کے اکابر کو شرف حضوری بخشتا اور عامۃ الناس کو اکرام شاہانہ سے گرویدہ بناتا ہؤا منزل ذی حرمین میں داخل ہو کر خیمہ زن ہو گیا۔ اس مقام سے شہر مدینہ نزدیک تر ہونے کے باعث مجوزہ تدبیروں پر آسانی سے عمل ہو سکتا تھا۔ وہ چار دن آرام کرنے کے بعد چند معاملہ فہم و نکتہ رس درباریوں کو پیام دے کر مدینہ روانہ کیا۔ وہ وفد کی صورت میں پہلے مخفی طور پر اوس اور خزرج سے ملاقی ہوئے اور ابو جبلیہ کی طرف سے پیام دیا کہ "حجاز آنے سے میرا مقصد سیر و سیاحت ہرگز نہیں، مجھے فیطون کے مظالم نیز یہودیوں کے جور و استبداد کی خبریں پہنچی ہیں۔ اُن سے متاثر ہو کر قسم کھائی ہے۔ کہ جب تک اس انسانیت سوز بربریت و خود سری کی سزا دیکر تمہارا اقتدار قائم نہ کر لونگا۔ چین سے نہ بیٹھونگا لیکن کھلم کھلا جنگ کرنے سے طوالت و مشکلات کا اندیشہ ہے۔ یہودیوں کے قلعہ بند ہو جانے کی حالت میں اُن پر قابو حاصل کرنا دشوار تر ہوگا۔ اس لئے حکمت عملی اور فریب سے کام لیتے ہوئے حریف کو مغلوب کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ اس ضرورت کے لئے شب شنبہ تجویز کی ہے۔ مقررہ رات کو تمام حجازی سردار اور ذی اثر یہودی شاہی ضیافت میں مدعو ہو کر ایک خیمے میں جمع ہوں گے۔ اور ٹھیک نصف شب گزرنے پر ٹھکانے لگا دیئے جائیں گے۔ تم اس اطلاع کو صیغۂ راز میں رکھتے ہوئے تیاری مکمل کر لو۔ جمعہ کا دن گزارنے کے بعد آدھی رات کو ہنگامہ گرم کرتے ہوئے ایوان حکومت پر قابض ہو جاؤ۔ خبردار! خبردار! کسی غیر کے کانوں میں اس راز کی بھنک نہ پڑنے پائے۔

اس خدمت سے فارغ ہو کر یہودی سرداروں سے ملے اور اپنے بادشاہ کا فرمان پیش کیا کہ "آپ لوگوں کے ملک میں میری آمد حریفانہ نہیں۔ بلکہ حلیفانہ ہے، میں دو ہمسایہ ملکوں میں رابطۂ محبت استوار کرنے کے لئے دوستی و اخوت کا ہاتھ دراز کرنا چاہتا ہوں۔ اگر آپ اور آپ کی قوم کے جملہ ذی مقدرت افراد میری آواز پر لبیک کا نعرہ بلند کرتے ہوئے ضیافت دوستانہ قبول کر لیں گے۔ تو وہ صلائے عام نہ صرف لطف و یگانگی کا موجب قرار پائے گی بلکہ حکومت شام و حجاز کے مابین سیاسی تعلقات بھی مضبوط و خوشگوار بنانے کا باعث ٹھہرے گی۔ مجھے کامل یقین ہے۔ کہ آپ کسی عنوان کا خدشہ محسوس کئے بغیر ذی حرمین آنے کی زحمت منظور کر لیجئے"۔

یہ دوستانہ پیغام یہودی سرداروں کو مژدۂ غیبی معلوم ہؤا۔ کیونکہ فیطون کے غیر متوقعانہ قتل نے ان کی حالتوں کو انتہا سے زیادہ تشویشناک بنا رکھا تھا۔ لمحہ بہ لمحہ عظیم الشان بغاوت کا اندیشہ ان کے ڈرے سہمے قلوب کو مضطرب کر رہا تھا۔ وہ اپنے بازوؤں میں اس سیلاب کو روک لینے کی قوت نہیں پاتے تھے۔ جو خود ان کی سخت گیریوں کے باعث نمودار ہونے والا تھا۔ یہی سبب تھا۔ کہ انہوں نے بے سوچے سمجھے ہی ابو جبلیہ کی دعوت پر رضامندی ظاہر کر دی۔

جمعہ کا ڈھلتا ہؤا آفتاب آہستہ آہستہ ارض مدینہ پر بکھری ہوئی طلائی کرنیں سمیٹنے میں مصروف ہو چکا تو یہودی سردار کمال خدم و حشم کے جلو میں اپنے

اپنے عشرت خانوں سے نکل نکل کر شاہی ضیافت سے لذت اندوز ہونے کو ذی حربین کی سمت روانہ ہونے لگے۔ اور چراغوں کے وقت تک مدینہ میں غیر یہودی کے سوا انے گنے ہی آدمی رہ گئے۔

ذی حربین کی پشت پر حریری خیمہ نصب ہو کر تماشائیوں کا مرکز نظر بن رہا تھا۔ اس کی شاہانہ سجاوٹ اہل حجاز کو دعوت نظارہ پیش کرنے میں سرمو کمی نہ کرتی تھی۔ مہمانوں کی پذیرائی کو معزز منصب داران شام موجود تھے۔ جو آنے والے یہودی سرداروں اور رئیسوں کو اعزاز و احترام سے ہاتھوں ہاتھ لے کر مناسب مقام پر بٹھا رہے تھے۔ اور خاطر مدارات کے جتنے بھی اصول ہو سکتے ہیں۔ اُن میں کوئی ایک بھی فراموش نہ ہونے پاتا تھا۔

مہمانوں کے جمع ہو جانے پر وسیع دستر خوان الوان نعمت سے آراستہ کر دیا گیا۔ حجازی غذاؤں کے پہلو بہ پہلو شامی طعام کی اشتہا آفریں مہک نے بھوک کے شعلے بھڑکا دیئے اور دعوت میں شریک ہونے والوں نے تکلف کو بالائے طاق رکھتے ہوئے خوب ہی شکم سیر ہو ہو کر کھایا۔

کھانے سے فراغت ہوئی تو بادۂ انگور کے جام بلوریں گردش میں آئے۔ حسین و جمیل ساقی بچوں نے مستانہ وار ساقی گری کرتے ہوئے حضار محفل کو چھکا دیا۔ ساتھ ہی ساتھ گلفام و نازک اندام کنیزوں نے چنگ ورباب کی لے پر رقص کا کمال دکھا دکھا کر ایسے لطیف و مدہوش کُن نغمے سنائے کہ فضا بھی مست ہو کر جھوم جھوم اُٹھی۔ نصف شب تک ہنگامۂ عیش و نشاط گرم رہا۔ پھر —————— پھر ابوجلیلہ کے ایک اشارۂ ابرو پر چنگ ورباب خاموش، رقص و نغمہ موقوف اور گردش جام پا بہ گل ہو گئی!

یہودی سرداروں کو فوری انقلاب نے متحیر کر دیا۔ ہنوز سکوت و برخاستگی کا سبب ذہن نشین نہ ہو سکا تھا۔ کہ ابوجلیلہ نے خطبہ پڑھنا شروع کیا۔ "معزز سرداران حجاز! مجھے مسرت ہے کہ آپ نے پیام ضیافت قبول کرتے ہوئے مجھے مہمان نوازی کا موقع دیا۔ اور مسافرت کے عالم میں جو کچھ ممکن تھا۔ میں نے پیش کرنے میں قصور نہیں کیا۔ در اصل یہ ضیافت حصول مقصد کے سلسلے کی یادگار ضیافت ہے۔ اور مستقبل اسے صفحات تاریخ میں جلی حرفوں کے ساتھ جگہ دیگا۔ اس ضیافت کو حجازی اور شامی قومیں کبھی سہو نہ کریں گی۔ نیز آنے والی نسلیں اس سے ہمیشہ مفید سبق حاصل کرتی رہیں گی۔ چونکہ رات بھیگ چلی ہے اور مملکت شام میں اس وقت ایک عجوبہ روزگار رقص سے ارباب طرب کی تفریح کا انتظام ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ حضرات نے اس رقص کا مشاہدہ کبھی نہیں کیا۔ وہ رقص جتنا خوفناک و دہشت آگیں ہے۔ اتنا ہی مسرت بخش و انبساط آفریں بھی ہے۔ لیکن رقص شروع ہونے سے قبل شام کی مخصوص شراب کا ایک ایک پیالہ پینا ناگزیر ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر پورا لطف نہیں مل سکتا۔"

ابوجلیلہ کا اشارہ پاتے ہی لالہ رخ کنیزیں زریں لباس سے ملبوس ضو فشاں قباؤں میں چمکتی دمکتی شیشہ و ساغر بدست محفل میں داخل ہوئیں اور کیف بار باجوں کی سریلی آوازوں پر رقص کرتی ہوئی یہودی سرداروں کو جام پیش کرنے میں مشغول ہو گئیں۔ محفل پر دوبارہ سماں چھا گیا۔ اور ارباب مزہ رقص و سرود کی سحریت سے مسحور ہو گئے۔ اُنہیں محسوس تک نہ ہو سکا کہ کب جام خالی ہوا۔ اور کس وقت پری چہرہ رقاصائیں رقص کرتی خیمے سے باہر نکل گئیں؟ وہ اُس گھڑی چونکے جب سیکڑوں قوی بازو حبشی غلاموں نے تیغ بکف محفل میں نازل ہو کر اُنہیں چمچماتی ہوئی تلواروں کے سائے میں لے لیا! مگر اب بجانے کیوں؟ نہ مدافعت کی طاقت تھی نہ فرار کی قدرت رکھتے تھے! وہ پتھر کی مورتوں کی طرح جہاں بیٹھے تھے۔ وہیں بے حس و حرکت جمے رہے اور حبشی غلاموں نے کمال تیزی و چابکدستی سے سر و گردن کا جھگڑا چکانا شروع کر دیا!

دوسری صبح کو ظاہر ہونے والا قاصد زریں چہرہ (آفتاب) افق نیلی پر نمودار ہوا اور طلائی شعاعوں کے مانند ارض حجاز و عراق پر جدید حکومت کے قیام اور یہودی فرمانروائی کے زوال کی خبریں پھیل گئیں۔ اور انصار کے جاہ و اقتدار کا مژدہ سناتا ہوا

صنفِ نازک کے لِکھے ہوئے ادب پارے

از
محترمہ کسم لتا بی-اے

۱۔ سندیس!

اے ساجن کے دیس کو جانے والی ہواؤ!
میرے چیت چور سے کہیو
اس سے بچھڑ کر
میرے دن دن نہ رہے
راتیں راتیں نہ رہیں
دل کا درد راتوں کی نیند بھی لے اُڑا
اب سپنوں میں بھی
ایک جھلک دیکھنے کی آس ٹوٹ گئی
اب تمہیں آ کر
ان پیاسی آنکھوں کی
پیاس بجھاؤ تو بجھے!

۲۔ ماضی!

سکھی!
آموں پر کوئلیں کوکتی ہیں
پھر نئی رُت نے انگڑائی لی ہے
اس سہانے سمے میں مجھے پھر
بھولے بسرے دنوں کی یاد آئی

۳۔ ہوک!

سکھی!
گاؤں کی گھنیری باری میں
کل سویرے جو کویل کوک اُٹھی
پھر
یکایک کسی کی یاد آئی
پھر درد کے مارے میرے دل میں ہوک اُٹھی

۴۔ آج بھی نہیں آئے

شام ہو گئی
کوّوں کے جوڑے ندی پار سے
رین بسیرے کے لئے
اپنے گھونسلوں کی طرف آنے لگے
میری مایوس نگاہیں
بیتاب آرزوئیں مضطرب تمنائیں
سٹیشن سے آنے والی
پگڈنڈی پر سسک سسک کر
دم توڑ رہی ہیں۔ لیکن
ان کی آخری ہچکی سننے والے
آج بھی نہیں آئے!

پرائی پیڑ

از
محترمہ ناہید جمال اعظمی

سکھی!
بے درد پپیہے سے
کون کہے کہ
پی پی کی رٹ لگا کر
میری برہ اگن کو اور نہ بھڑکائے
ان رِم جھم برسنے والے بادلوں سے
کون کہے کہ کہیں اور جا کر برسیں
ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں سے
کون کہے کہ میرے دل کو نہ گدگدائیں
یہ کیا جانیں کہ
جس کا دل رو رہا ہو
اس کے ہونٹوں پر کیا ہنسی آئے
بھلا کسی نے پرائی پیڑ سمجھی ہے؟

ٹوٹا ہوا تارہ

از

محترمہ حور درخشاں بلگرامی

دور آسمان پر ——— ایک درخشاں ستارہ تھا۔

ہر روز ——— ہر سحر کے بعد ——— شب کی تاریکی میں ——— آنسو کی طرح آسمان کی پلکوں پر کانپتا رہتا تھا۔

میں اُسے اپنی زندگی کا سہارا سمجھتی تھی۔

میری پُرنم نظریں۔ فرطِ الم سے کانپتا ہوا دل ——— اسے چاند کے روشن پہلو میں دیکھ کر مسرت سے چیخ اٹھتا۔ اس چھوٹے سے چمکتے ہوئے تارے میں ——— جو طوفانِ اجل کے تھپیڑوں میں بھی مسکراتا رہتا۔ میری خوشیاں مستور تھیں۔ مجھے محسوس ہوتا جیسے وہ کہہ رہا ہو ——— "اے دوست غم نہ کر ——— اپنے فردوسِ محبت کو برباد ہوتے دیکھ کر دکھی کیوں ہے ——— " جب تیری رنگین آرزوئیں تجھ سے چھین لی جائیں گی، تو ایک بھٹکتی ہوئی روح ہوگا۔ اس وقت میں تجھے چھپا لونگا۔ اپنے روشن سینے میں ———"

میں ان دنوں کا تصور کرکے مسرور ہوجاتی تھی ——— میں تجھے ہر روز دیکھتی ——— اور تو اے درخشاں تارے ——— ایک حسین و نوخیز کونپل کی طرح ——— شبنم کے تابناک قطرے کی طرح مسکراتا ہوا لرزاں ہوتا ———!!!

ایک رات ——— آسمان روشن تھا۔ جذبات انگیز ہوائیں سرسبز ٹہنیوں سے سرگوشیاں کررہی تھیں ——— میں نے تجھ کو تلاش کیا۔ آسمان کی نیلی نیلی لامحدود وسعتوں میں

لیکن آہ ——— تو ٹوٹ چکا تھا ——— تارے ٹکراتے ہیں اور ایک تیز چمک کے بعد نامعلوم سیاہیوں میں کھو جاتے ہیں ——— او میرے ننھے تارے تو بھی شاید ٹکرا چکا تھا ———!!!

بتا اب میری آرزوؤں کے پھول کس طرح کھلیں گے ———؟

میری روح میں غم کے شعلے بھڑک اُٹھے ہیں !!!

میری تمنائیں وہاں بھٹک رہی ہیں ——— جہاں شکستہ روحوں کے ارمان کچھ دیر سلگ کر ٹھنڈے ہوجاتے ہیں۔

او میری آرزوؤں کے روشن ستارے! تو نے کس دنیا کو اپنا مسکن بنایا ہے ———

تیرے پانے کی آرزو کتنی جاں گداز ہے ———!!!

میرا دل کانپ سا جاتا ہے پھر ایک بار تجھے دیکھنے کے لئے ———

او میرے ٹوٹے ہوئے تارے ———!!!

نامور افسانہ نگار خاتون پروفیسر مس کرشنا کماری بی۔ اے
کے بہترین افسانوں کا دلفریب مجموعہ
میرے سپنے
میرے سپنے کیا ہیں؟
زندگی کی اصلی تصویریں۔ محبت کے سچے نغمے
جوانی کی مسکراہٹیں۔ دوشیزگی کی انگڑائیاں
ہر افسانہ اپنی جگہ شاہکار ہے۔ افسانوں کا یہ بہترین مجموعہ اُردو ادب میں بالکل نئی چیز ہے۔ یوں تو کیا مرد کیا عورت سبھی خواب دیکھتے ہیں۔ لیکن ایک عورت کی آنکھوں میں جو خواب مسکراتے ہیں۔ اُن کی شگفتگی۔ رنگینی اور دلفریبی کا کیا کہنا!
مصنفہ نے کتاب کے دیباچے میں لکھا ہے۔ "میرے سپنے پر آپ کو حقیقت کا گمان ہوگا۔ کبھی آپ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر جائے گی۔ کبھی بے اختیار آنکھوں میں آنسو بھر آئیں گے۔ اور میرے بیشتر سپنوں پر آپ کو اپنے ہی خوابوں کا گمان ہوگا۔" کاغذ۔ کتابت۔ طباعت اعلیٰ۔ مجلد۔ رنگین گردپوش قیمت فی جلد صرف تین روپیہ
مینیجر "بیسویں صدی" بیرون شاہ عالمی دروازہ۔ لاہور

افسانہ

از

جناب دت۔ بھارتی

یہ میں جانتا ہوں کہ وہ خط نہ لکھیں گے، لیکن "ڈاک کا انتظار" ایک جنون کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ اور آج کی ڈاک میں محترمی خوشتر گرامی صاحب کا گرامی نامہ بھی موصول ہوا۔ جس میں آپ افسانہ اور تصویر کے علاوہ حالات زندگی بھی طلب فرما رہے ہیں۔ بھلا ایک ادیب اور پھر ہندوستانی ادیب کے حالات زندگی سے کسی کو کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ بہر حال تعمیل ارشاد کے طور پر اپنے مختصر حالات سپرد قلم کر رہا ہوں۔

اپنے عالم وجود میں آنے کے متعلق میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا۔ اور نہ ماں یا باپ ہی میں سے کوئی آج موجود ہے جو اس پر روشنی ڈال سکے۔ بہر حال کسی کا خیال ہے کہ میں ۱۹۲۴ء یا ۱۹۲۵ء میں پیدا ہوا۔

بچپن ہی میں ماں کی بے وقت موت اور کچی جوانی میں باپ کی جدائی نے زندگی کو تلخیوں سے بھر دیا۔ اس کے لئے میں اُن تمام رشتے داروں کا ممنون ہوں۔ جن کی کرم فرمائیاں میں تو کیا میری اولاد بھی نہ بھول سکے گی۔ خصوصاً وہ رات جب میرے قتل کی کوشش کی گئی۔ لیکن (ع)

میں بہت خوش ہوں کہ مجھ کو زیست کا حاصل ملا!

شاید یہ زندگی کی تلخیاں ہی تھیں۔ جنہوں نے مجھے اپنے ہم عمروں سے بہت آگے لا پھینکا۔ تعلیم کبھی بھی مکمل نہ ہو سکی۔ بعض حالات کے پیش نظر کالج میں آرٹس کو خیر باد کہہ کر کامرس لیا۔ لیکن امتحان ریڈیو میکنزم کا پاس کیا۔ اور حالات نے کلرکی کرنے پر مجبور کر دیا۔ اگر آج یہ افسانے نہ لکھے جاتے۔ تو میرے کندھے پر تین ستارے جگمگا رہے ہوتے۔ یا برما کے محاذ پر میری لاش گل گئے اور گیدڑ لنچ بنا لیتے۔ ہو سکتا ہے تین فائر سے سلامی دیدی جاتی۔ یہ اُس خواب کی تعبیر ہے جو ایک عزیز دوست کی مبارک شادی پر دیکھا تھا۔ اور آجکل یہ حالت ہے

مری بربادیاں، لوگوں کے طعنے، اُن کی خاموشی

یہی دو چار باتیں بن گئی ہیں داستاں میری

کئی پاپڑ بیل چکا ہوں۔ سیر و سیاحت کا دلدادہ ہوں۔ تمام ہندوستان گھوم چکا ہوں۔ اور اب سمندر پار جانے کا ارادہ رکھتا ہوں اور ممکن ہے کہ ان سطور کی اشاعت کے وقت کسی غیر ملک کی تہذیب و تمدن سے ہمکنار ہو رہا ہوں۔

رومانی اور انقلابی افسانوں کا ایک مجموعہ "پیاسی آنکھیں" شائع ہو چکا ہے۔ دوسرا "بھوک کے پیاسے" تیار ہے۔ ایک ناول "چوٹ" لکھ رہا ہوں۔ نہ معلوم کب ختم ہو گا۔ اور ہو گا بھی یا نہیں؟

دت بھارتی

اب وہ کیا آتی .... ؟ جب کہ "بارہ بجکر دس منٹ" ہو گئے تھے میں نے ایک تیز نگاہ گھڑی پر ڈالی۔ جہاں دونوں بازوؤں کے درمیان کا فاصلہ لمحہ بہ لمحہ زیادہ ہی ہوتا جارہا تھا۔ اور جس قدر یہ فاصلہ بڑھتا جاتا تھا۔ اُس کے آنے کی اُمید بھی کم ہوتی جارہی تھی۔ آنے کا خیال ذہن میں تحلیل ہوا چاہتا تھا۔

پونے بارہ بجے میں چاہتا تھا۔ کہ جلد از جلد گھڑی کے دونوں بازو ایک ہو جائیں۔ کیونکہ دونوں بازوؤں کا ایک ہو جانا ہی اُس کی آمد کا اعلان تھا۔ لیکن گھڑی تھی کہ اُس کے قلب کی حرکت بند ہوا چاہتی تھی۔ اور اس قدر

سست رفتار سے چل رہی تھی جیسے وہ خود محبت کی آگ میں سسک رہی ہو۔ مجھے اس سستی پر رہ رہ کر غصّہ آتا۔ کئی دفعہ جی میں آئی کہ اُٹھ کر گھڑی کے دونوں بازوؤں کو ایک کر دوں۔ لیکن ایک کر دینے سے وہ تو نہ آ جائے گی۔ اُف! وہ پندرہ منٹ یوں گزرے جیسے ایک دور گزر جائے ایک موسم دوسرے میں تبدیل ہو جائے، تاریکی کی جگہ اُجالا لے لے۔

ٹھیک بارہ بجے میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ اتنی تیز کہ وہ گھڑی کی مسلسل ٹک ٹک کی طرح سُنی جا سکتی تھیں۔ گلی میں ہر آہٹ اُسی کے پاؤں کی آہٹ بن جاتی۔ میری بیتاب اور بیقرار نظریں کھلے ہوئے دروازے کو چیر کر راہرو پر جا پڑتیں۔ لیکن مایوس ہو کر کمرے میں لوٹ آتیں۔ پھر وہی گھڑی کا جائزہ شروع ہو جاتا۔

خون کی رفتار ضرورت سے زیادہ تیز ہو چکی تھی۔ نبض ارمانوں کی طرح دھڑک رہی تھی۔ سیکڑوں ولولے برساتی جانوروں کی طرح پیدا ہو رہے تھے اور گھڑی نے بارہ پانچ بجائے تو کانوں نے مستعدی سے کام شروع کر دیا بچارے ہر آہٹ پر چونک جاتے۔ اچانک گلی میں پھٹ ——— پھٹ ——— چپل سے چلنے کی آواز آئی۔ "لیکن وہ تو چپل نہیں پہنتی ———" دل نے جواب دیا، "پھر یہ کون ——— ؟" "کیا معلوم آج چپل ہی پہن آئی ہو" ذہن نے تسلی دی۔ پھر وہ دھیمی آواز بلند ہوتی گئی۔ جس طرح بیہوش مریض کو آکسیجن سنگھانے سے ہوش میں لایا جاتا ہے۔ دھڑکنیں سینے کے اندر گیت کے سروں کی طرح اُبھرنے لگیں، وہ آئی ——— وہ آئی ——— وہ لیکن یہ ڈاکیا تھا۔ اور دروازے میں تین خطوط پھینک گیا۔ اور وقت ہوتا تو کتنا ہی ضروری کام، چھوڑ کر خطوط کی طرف توجہ دیتا ہوں۔ لیکن اُس روز میں نے خطوط کو بے رخی اور اُبالی پن سے اُٹھایا۔ اور بغیر پڑھے میز پر پٹک دیا۔ اضطراب بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ ذہن میں بڑے بڑے بھنور پیدا ہو رہے تھے۔ پھر نگاہیں گھڑی کا طواف کرنے لگیں بارہ دس ——— اُف۔ اب کس قدر تیزی سے چل رہی تھی۔ جیسے انسان مرتے وقت آخری سانسیں لیتا ہے۔ ایک دفعہ جی نے چاہا۔ اُٹھ کر پھر بازوؤں کو ایک کر دوں ——— لیکن گلی میں کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ نہایت سہمی ہوئی۔ کسی کے احساسات کی طرح دبی ہوئی۔ "وہ ضرور

وہی ہے! ——— "دل کی عمیق ترین گہرائیوں سے خیال اُٹھا ——— بے جان' اور سوتے ہوئے احساسات پھر بیدار ہوئے۔ اور امید بندھ گئی۔ یہ کوئی راہگیر تھا ——— اب صبر کی تاب نہ رہی۔ جوش سے میں جھلّا اُٹھا۔ میرے بس میں ہو تو ان گزرنے والوں کا ادھر سے گزرنا بند کر دوں۔ آخر یہ کیوں بدگمانی پیدا کرتے ہیں ——— لیکن ایسے ایسے خواب تو میں اکثر جاگتے میں دیکھتا رہتا ہوں۔

اب بارہ بجکر تیرہ منٹ ہوئے تھے۔

مقررہ وقت سے صرف تیرہ منٹ زیادہ ہوئے تھے۔ لیکن میں نے فیصلہ دیدیا تھا کہ اب وہ نہ آئے گی۔

میں اُٹھا اور کمرے میں دیوانہ وار چکر لگانے لگا۔ فرش پر چند کتابیں پڑی تھیں۔ میں نے غصّے سے جھلّا کر اُن بے جان کتابوں ہی پر پاؤں کی ٹھوکر سے ظلم ڈھا دیا۔ کتابیں ٹھوکر سے اس طرح اُچھلیں جیسے کوئی منتظر عاشق اپنی محبوبہ کو آتے ہوئے دیکھ کر فرطِ مسرت سے بچوں کی طرح اُچھل پڑے۔ مجھے احساس ہوا کہ یہ ٹھوکر میں نے کتابوں پر نہیں لگائی ہے۔ بلکہ اُس دوشی پر لگائی ہے' جو مجھے اس طرح کئی دفعہ دھوکا فریب دے چکی ہے۔ ہر دفعہ وہ مجھے اسی طرح تڑپاتی ہے جب میں گولی کھائے ہوئے سپاہی کی طرح تڑپ تڑپ کر نڈھال ہو جاتا ہوں۔ تو وہ فتنے اور ارمان جگانے چلی آتی ہے۔ اپنے آنچل کی لہروں سے میرے جذبات کو بیدار کر دیتی ہے۔ اگرچہ میں اُس سے روٹھ جانے کا مصمم تہیّہ کر لیتا ہوں۔ اور یہاں تک فیصلہ کر لیتا ہوں کہ اس سے شادی ہی نہیں کرونگا۔ لیکن جب وہ مسکراتی ہوئی آنکھوں، تھرتھراتے ہوئے ہونٹوں سے اور تمتماتے ہوئے رخساروں سے ایک خاموش گیت سنا دیتی ہے تو میں بے اختیار ہو کر اسے اپنے گلے سے لگا لیتا ہوں۔ اور پھر وہ شکوے، گلے، شکایتیں شکست کھا کر بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔

لیکن آج

آج پھر اُس نے وہی حرکت کی ہے۔ میں نہایت ضروری کام چھوڑ کر اُس کا انتظار کر رہا ہوں۔ نہ جانے کس بہانے سے بہن کو بازار بھیجا ہے تاکہ میں اس سے خلوت میں مل سکوں۔ ہماری باتوں میں کوئی مخل نہ ہو۔

لیکن وہ ہے کہ وعدہ اور وقت معین کر کے آنے کا نام ہی نہیں لیتی۔

کتابیں ٹھوکر کھانے کے بعد دیوار سے جا ٹکرائیں، اور اُن کے اوراق کھل گئے۔ سفید اوراق ہوا کے جھونکوں سے پھڑپھڑانے لگے۔ اس پھڑپھڑاہٹ کو دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ تمسخر اڑا رہے ہوں۔ وہ کتاب کے ورق نہیں سپید دانت ہیں۔ جو میری دیوانگی پر منہ کھولے ہوتے ہیں! میں نے شعلہ بار آنکھوں سے اُن ہنستے ہوئے اوراق کو دیکھا، لیکن اُن پر چھپے ہوئے سیاہ حروف نے میرے انتقام کو ہمدردی میں تبدیل کر دیا۔ میں نے یوں محسوس کیا جیسے یہ ورق میرا مذاق نہیں اڑا رہے ہیں، اپنے سینے کے سیاہ داغ دکھا رہے ہیں۔ اس احساس نے میری ہمدردی میں مزید اضافہ کر دیا۔ کیوں؟ میرے سینے میں بھی تو سیاہ داغ ہیں۔ ہر داغ ایک الم ناک داستان کا عنوان ہے۔ اور کتاب کے تو ہر حصہ پر داغ ہی داغ ہیں۔

داغ

چند لمحوں کے لئے میں ٹھٹک گیا میرے ذہن میں چند خیالات رینگنے لگے۔

"میں بھی اپنے داغ کاغذ پر کیوں نہ بکھیر دوں ——"

میں کرسی میں دراز ہو گیا۔ میز سے رائٹنگ پیڈ اٹھایا۔ پن نکالا اور اپنے داغ بکھیرنا شروع کر دیئے —— اگرچہ اس سے پہلے بھی اس طرح خطوط لکھ چکا ہوں لیکن ورشی کو دیکھتے ہی اپنے ولولوں کی طرح پھاڑ دیتا ہوں۔ لیکن آج تو قسم کھاتا ہوں، قسم —— ا چند لمحوں کیلئے میں چونکا —— ہاں! قسم —— بھلا کس کی —— ؟ دیوار پر لٹکتے ہوئے شوجی کی —— ؟ نہیں۔ وہ دیوتا ہیں۔ اپنی —— ؟ نہیں —— !!

"ورشی کی —— ؟" نہیں وہ بیوفا ہے۔

پھر کس کی —— ؟

میری نگاہیں کمرے کا جائزہ لینے لگیں، لیکن مجھے ایسی کوئی بھی عزیز شے دکھائی نہ دی۔ جس کی میں قسم کھاتا —— اچانک میری نگاہیں دیوار کے سہارے کھڑی ہوئی سائیکل سے جا ٹکرائیں —— میں سنبھلا —— اور میرے چہرے پر ایک لطیف مسکراہٹ پھیل گئی۔ ہاں! سائیکل کی قسم سب سے بہتر رہے گی —— ایک کلرک سے پوچھو، سائیکل اُسے کتنی عزیز ہے۔ سائیکل اُس کی زندگی کا جزو ہے۔ محبوبہ کے بعد سائیکل ہی ہوتی ہے جس سے وہ عشق کرتا ہے۔ اور میں بھی تو ایک یتیم کلرک ہوں!

میں نے سائیکل کی قسم لی ——۔

سائیکل کی قسم کھاتے وقت مجھے زبان کو کوئی ساکیسلا اور کڑوا سا ذائقہ محسوس ہوا ——۔

پھر بکنا شروع کر دیا ——۔

ورشی!

تمہارا خیال ہے کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ اور یہ محبت یا عشق اس درجہ تک پہنچ چکا ہے۔ کہ میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ تم ہی میری پہلی اور آخری خواہش ہو —— تمہیں اپنے بارے میں بہت سی غلط فہمیاں ہو گئی ہیں۔ تمہارا خیال ہے۔ تم بے حد حسین ہو، تعلیم یافتہ ہو۔ تمہاری آواز میں ایک لوچ ہے۔ ایک رس ہے۔ شیریں نغمے ہیں۔ لیکن

حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ تمہارے خدوخال معمولی اور سیدھے
سادے ہیں۔ تمہاری آواز میں بھی ایسی کوئی دلکشی نہیں ہے، جو مجھے متاثر
کر سکے۔ نہ ہی تم اتنی تعلیم یافتہ ہو، کہ ہمیشہ ایک نئے رومان سے میرا
خیر مقدم کرو۔ یہ تمہاری غلط فہمیاں ہیں۔ جنہیں تم نے خواہ مخواہ پیدا
کیا ہے۔ میں آج ہر طرح کے مغالطے کو تمہارے ذہن سے دور کر دینا
چاہتا ہوں۔

تمہارا خیال ہے کہ اب ہماری سگائی ہو گئی ہے۔ اس لئے شادی
ضروری ہے ——— اس خیال کو تم مطلق اپنے ذہن میں جگہ نہ دو۔ ہاں!
کبھی تم مجھے ضرور جاذب نظر دکھائی دیتی تھیں، وہ بھی یونہی
اگرچہ تم میں کوئی خاص بات نہیں ہے۔ پھر تم نے نہ معلوم بہن کو کیا رشوت
دی کہ اُنہوں نے مجھے مجبور کیا۔ کہ میں تمہارے ساتھ شادی کر لوں۔ اور میں بھی
کتنا معصوم نکلا۔ کہ تم جیسی کافر ادا لڑکی سے شادی کے لئے تیار ہو گیا
لیکن اب میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ تم کبھی بھی میرا کامیاب جیون ساتھی
نہیں بن سکتیں۔ تم ایک ایسا گیت ہو۔ جس کی لے نہ ہو۔ ایک ایسا پھول
جس میں خوشبو نہ ہو

میں نے تم کو سیکڑوں مرتبہ کہلا بھیجا ہے۔ کہ تم اپنی عادات کو بدل
لو۔ لیکن تم نے کبھی میری بات پر غور ہی نہیں کیا۔ کوئی توجہ ہی نہ دی
اسی وجہ سے پہلے تمہارے لئے میرے دل میں بیزاری تھی۔ لیکن اب
میں تم سے نفرت کرتا ہوں۔ میں سچ کہتا ہوں، میں تم سے دلی نفرت کرتا
ہوں اور یہ نفرت میری اور تمہاری ذات میں ایک خلیج کی طرح حائل ہو گئی
ہے۔ اسی کشیدگی نے ایک ایسا فاصلہ ڈال دیا ہے۔ جو کبھی بھی پر نہیں
ہو سکتا۔ ہم دونوں کی مختلف شاہراہیں ہیں۔ میرے اور تمہارے خیالات
میں زمین اور آسمان کا فرق ہے ...... اور پھر اب تو میں تم سے
نفرت کرتا ہوں۔ ایک ایسی نفرت جو کبھی بھی محبت سے بدل نہیں سکتی۔
میں جب بھی تمہاری خامیاں تم پر واضح کرتا ہوں۔ تو تم انہیں دور کرنے
کے بجائے مجھ میں ڈھونڈنا شروع کر دیتی ہو۔ اپنے کمزور پہلوؤں کو کبھی
بھی درست نہیں کرتیں۔ اس کے برعکس میری ذات پر رکیک حملے شروع
کر دیتی ہو۔ بیجا مذاق، طنز بھرے وار شروع کر دیتی ہو۔ میں ان کو گوارا
نہیں کر سکتا۔ یہ سب میری برداشت سے باہر ہے۔ تمہارے ہر جملہ سے
غرور ٹپکتا دکھائی دیتا ہے۔ تمہاری حرکات تکبر سے بھری ہوتی ہے۔ تمہارا
ہر اشارہ ایک گران بوجھ ہے۔

تم اچھی طرح جانتی ہو۔ کہ میں ایک کلرک ہوں، اور جب تم کلرک
کی بیوی بن جاؤ گی، تو تمہیں اس قدر رنج کا کام کرنا پڑیگا۔ کہ تمہاری یہ سب
ادائیں، نخرے، چلبلا پن، کسی غریب کی روح کی طرح دم توڑ دیں گی۔ تم
میری عادات سے اچھی طرح واقف ہو۔ میں کتنا بے پروا اور بے فکرا ہوں
میں کتنا کاہل اور آرام طلب ہوں۔ کہ کبھی اپنے کپڑے ترتیب سے نہیں رکھ
سکتا۔ میری کتابیں ضروری کاغذ میرے خیالات کی طرح منتشر رہتے ہیں۔ مجھے
اس کا بھی خیال نہیں ہوتا کہ میری جیب میں پیسے کتنے ہیں۔ یہ تو بہن ہی ہے
جو مجھ غریب کی بچوں کی طرح دیکھ بھال کرتی ہے۔ ورنہ میرا تو بُرا حال ہو۔
بہن صبح سے شام تک کئی بار کمرہ صاف کرتی ہے۔ اور میں جب گھر پر ہوتا
ہوں۔ کمرے میں اسی رفتار سے غلاظت پھیلاتا رہتا ہوں ——— اگر تم ہو تو ایک
دن میں تنگ آ جاؤ۔ اور یہ سب چھوڑ چھاڑ بھاگنے کی فکر کرو۔ لیکن میری
بیوی بن جانے کے بعد تمہیں یہ سب برداشت کرنا پڑیگا۔ ان سب کے
علاوہ بازار سے سودا سلف لانا۔ رنج کے کام، گھریلو سوالات کا حل اور
سب سے زیادہ ضروری اُن بچوں کی پرورش ہو گی جنہیں میں ہر سال بغیر
سوچے سمجھے پیدا کرتا ہونگا۔

ان حالات کے باوجود تمہاری یہ حالت ہے کہ ایک روز میں نے تم
سے کہا کہ میری کتابیں ہی ترتیب سے رکھ دو۔ بیچاری عورت کے ہاتھوں
کے لمس کو ترس رہی ہیں ——— پہلے تو تم مباحثہ میں پڑ گئیں پھر
حیلے شروع کر دیئے۔ جب میں نے بہت کچھ سُنا۔ تو کتابوں کی وہ کھچڑی
بنادی۔ کہ اگلے روز جب میں نے الماری کھولی تو نظم کی کتابیں نثر
میں پائیں۔ ناول فلسفہ کی کتب کے ساتھ آرام فرما رہے تھے۔ اور معاشیات
کی کتابیں سیاسی بہنوں سے بغلگیر ہو رہی تھیں ——— اس اکھاڑے
کو دیکھ کر میں نے چیخنا شروع کر دیا۔ اور بہن نے آکر انہیں ترتیب دیا۔
اُس روز تم پھر آئیں ———

بہن سسرال گئی ہوئی تھی۔ اور تم نہ معلوم کہاں سے آ گئیں۔ تم
اُس روز خوشی سے پھولی نہ سماتی تھیں۔ مسرت تمہارے ہر عضو سے پھوٹ
رہی تھی۔ چہرے پر شوخی رقص کر رہی تھی۔ آنکھوں میں ایک لطیف سرور

تھا۔ وہی جوانی کا سرور ——— میں بیٹھا قمیص کے بٹن ٹانک رہا تھا۔ تمہارے داخل ہوتے ہی میرا کمرہ مجرم کی طرح کانپ اٹھا۔ ہر چیز تھرتھرانے لگی اس "زلزلے" کے بعد دھماکا ہوا "جے ہند ———" اتنا کہہ کر تم نے قمیص میرے ہاتھ سے چھین لی۔ میں اس بے وقت مذاق سے جھلا اٹھا۔ آخر تم اتنی احمق کیوں ہو جہالت کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ میں نے ایک تیز گہری نظر تم پر ڈالی۔ ایک ننھا سا سہ رنگا جھنڈا تمہارے سینے کے ابھار سے چمٹا ہوا تھا۔

"یہ کیا حماقت ہے ———؟" میں جھلایا۔

"جے ہند ———"

"شٹ اپ ———"

"جے ہند ———" اور تم نے ایک فوجی سلام دیا۔

اور پھر میں بے اختیار ہنس پڑا۔

"کہاں کی تیاری ہے ———؟" میرا غصہ ٹھنڈا ہو چکا تھا۔

"مہاتما جی کے درشن کرنے ———"

"تم ———؟"

"ہاں! ہیں ———"

"لیکن تم نہیں جا سکتیں ———"

میرے انکار کے باوجود تم چلی گئیں۔ کیونکہ باہر تمہاری سہیلیاں تمہارا انتظار کر رہی تھیں۔

تمہیں واضح ہونا چاہئے۔ کہ تم ایک کلرک کی ہونے والی بیوی ہو۔ یہ سیاست کے جھگڑے چھوڑ دو۔ یہ "جے ہند" اور "درشن" ہمیں زیبا نہیں دیتے ان کیلئے قربانی ایثار اور ریاضت کی ضرورت ہے۔ جو ہم بزدل اور ضمیر فروش کلرکوں کے پاس کہاں ———؟ اور اگر یہ بات میرے دفتر میں پہنچ گئی۔ کہ میری ہونے والی بیوی "جے ہند" کہتی ہے۔ تو یہ ساٹھ روپے کی عارضی کلرکی بھی ہاتھ سے جاتی رہے گی اور اس سیاست سے زیادہ ضروری بچے پالنا ہے۔ میں تمہیں بیسیوں مرتبہ کہہ چکا ہوں۔ کہ تم بچے پالنا سیکھ لو ——— لیکن تم ہو کہ دھیان ہی نہیں دیتیں۔ ابھی پچھلے مہینے تمہاری ماں نے ایک غلام پیدا کیا ہے۔ اُس کی پرورش کا ذمہ تم اپنے سر لے لو۔ تاکہ تمہیں باقاعدہ تربیت مل سکے ——— لیکن تم سے کسی نیک کام کی توقع کرنا ایک سراب ہے۔

پھر مہاتما جی کے درشن سے زیادہ ضروری میری قمیص کے بٹن تھے جنہیں تم نے ٹانکنے کی تکلیف گوارا نہیں کی۔ اُلٹے مجھ پر پھبتیاں کسیں اور یہ جا وہ جا۔

ان حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ کہ میں تم سے شادی کر کے بھی خوش نہیں رہ سکتا۔ اس لئے تم اپنے دل سے یہ خیال نکال دو ———"

اچانک کمرے کے دروازے زور سے ٹکرائے اور درشتی آندھی کی طرح اندر داخل ہوئی۔ میں نے خط ایک طرف کیا۔

"تم ———" میں غصے میں صرف اتنا ہی کہہ سکا۔

"میں ———" اُس نے سادگی سے کہا۔

"کیا بجا ہے ———؟" میں نے سخت آواز میں کہا۔

"سوا ———" اُس نے پھر ملائمت سے جواب دیا۔ "اور آج تو حد ہو گئی۔

میں آپ کے لئے تکیے کا غلاف سی رہی تھی۔ کہ مشین کی سوئی انگلی میں اُتر گئی"۔ اُس نے پٹی بندھی ہوئی انگلی دکھاتے ہوئے خوبصورت کاڑھا ہوا غلاف میرے آگے کر دیا۔

میرے دل میں محبت کا بے پناہ سیلاب اُمڈ آیا۔ میں تڑپ کر اُٹھا غلاف کو ایک طرف رکھا۔ اور اُس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ "کیا گہرا زخم آیا ہے ———؟" میں نے گھبراہٹ بھرے لہجے میں کہا۔

"نہیں گھبرانے کی کوئی بات نہیں"۔ اُس نے معصومیت سے کہا "اور یہ آپ کیا لکھ رہے تھے ......؟" اُس نے لکھے ہوئے کاغذات کو دیکھ کر کہا۔

"کچھ نہیں ———" میں جلدی سے خط کی طرف بڑھا۔ اور اُٹھا کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔

"کیا تھا ———؟" وہ حیرانی سے بولی۔

"میاؤں ———"

ہم دونوں کھِل کھِلا کر ہنس پڑے۔

از

جناب حاجی لق لق مدیر روزنامہ "زمیندار"

ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ضرورتیں نئی نئی ایجادیں کراتی رہتی ہیں۔ہندوستان
ے آزادی پسندوں نے کسی زمانے میں اپنے وطن سے عقیدت ظاہر کرنے کیلئے "بندے
اترم" کا نعرہ ایجاد کیا۔جب فضا ہندوستانی وطن پرستوں کے لئے زیادہ سازگار
وگئی اور انگریز کا ڈر ہندوستانیوں کے دل سے اتر گیا۔تو انگریزوں کے خلاف
ہندوستان چھوڑدو" کا نعرہ ایجاد ہوا۔اس اثناء میں ہندوستان سے باہر ہندوستانی
فواج نے جو انگریزوں کے دشمنوں کی قید میں تھیں۔مسٹر سوبھاش چندر بوس کی
وشش و محنت سے "آزاد ہند فوج" بنالی۔اور اس فوج کا قومی نعرہ "جے ہند"
تجویز ہوا۔آج یہ نعرہ ہندوستان کے وطن پرستوں میں اس قدر مقبول ہو رہا ہے۔کہ
پنڈت جواہر لال نہرو بھی اپنی تقریر کو اسی نعرے سے شروع اور اسی پر ختم کرتے
یں۔یہی نہیں۔بلکہ چٹھیوں کی ابتدا بھی "جے ہند" سے ہوتی ہے۔اور انتہا بھی
جے ہند" پر۔یعنی اوپر بھی "جے ہند" نیچے بھی "جے ہند" گویا اوڑھنا بچھونا "جے
ہند" ہی ہے۔یا یوں کہئے۔کہ "جے ہند" اس سردی کے موسم میں لحاف اور توشک
کا کام دیتا ہے ——— "جے ہند!"

(۲)

میں نے عرض کیا ہے۔کہ ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔سٹینڈرڈ ہوٹل لاہور
یں ایک دلچسپ واقعہ ہوا۔رات کے ساڑھے گیارہ بجے ہندوستانی طلبہ اور
گورے نوجوانوں کی پارٹی میں (جن میں اینگلو انڈین اور امریکن شامل تھے) ایک
ینگلو انڈین لڑکی پر تکرار ہو گئی۔یہ تو معلوم نہیں ہوا۔کہ دونوں پارٹیاں چاہتی
کیا تھیں۔بہرحال صورت حال نازک ہو گئی۔طلبہ ہوٹل سے باہر نکل آئے۔اور انہوں
ف اینگلو انڈین اور امریکن نوجوانوں کے خلاف "ہندوستان چھوڑدو" کی بجائے
ہوٹل چھوڑدو" کے نعرے لگانے شروع کر دیئے۔گورے نوجوانوں نے خدا کا شکر
ادا کیا۔کہ یا تو یہ ہندوستانی ہم سے ہندوستان چھڑانے پر تلے ہوئے تھے۔یا اب
صرف ہوٹل چھڑوانا چاہتے ہیں۔چنانچہ انہوں نے فوراً معافی مانگ لی یعنی ہندوستان
چھوڑدو" نعرہ کے پاکٹ ایڈیشن "ہوٹل چھوڑدو" نعرے نے جادو کا اثر کیا۔اور
ہندوستانی محبان وطن کے مقابلے میں لاہور کے ان طلبہ کو پوری کامیابی ہو گئی۔
اب اس کامیابی کی خوشی میں وہ لیڈروں کو "زندہ باد" کرنے لگے۔

(۳)

جو نعرے طلبہ نے اپنی کامیابی کے بعد بلند کرنے شروع کر دیئے وہ یہ تھے۔
"مسٹر جناح زندہ باد"۔"پنڈت نہرو زندہ باد" اور "ماسٹر تارا سنگھ زندہ باد" لیکن ان
کے ساتھ ایک نعرہ اور بھی تھا وہ یہ کہ "قومی نعرہ ——— بیگم پارہ"۔آپ جانتے
ہوں گے کہ بیگم پارہ ایک فلمی ایکٹرس ہے اور حیران ہوں گے۔کہ یہاں "بیگم پارہ
زندہ باد" کے نعرے لگانے کی کیا ضرورت تھی؟ ضرورت یہ تھی۔کہ جھگڑا ایک
لڑکی پر ہوا تھا۔اور اس جھگڑے میں فتح حاصل کرنے کے بعد ضروری تھا۔کہ
جہاں چند مردانہ نعرے لگائے جائیں۔وہاں ایک عدد زنانہ نعرہ بھی لگا دیا
جائے۔اس ضرورت کے باعث بیگم پارہ کا نعرہ بھی لگا دیا گیا۔سچ ہے ضرورت
ایجاد کی ماں ہے۔اور بیگم پارہ خوش قسمت ہے۔کہ طلبہ کی ضرورت نے اسے
لیڈروں کی صف میں کھڑا کر دیا۔مسٹر جناح "پاکستان" کا مطالبہ کر رہے ہیں۔
پنڈت نہرو "ہندواستھان" کے حامی ہیں۔ماسٹر تارا سنگھ "خالصستان" چاہتے
ہیں۔بیگم پارہ چونکہ لیڈروں کی صف میں آگئی ہے۔اس لئے اسے "فلمستان"
کا مطالبہ کرنا چاہیئے۔

(۴)

بمبئی سے خبر آئی ہے۔کہ وہاں ایک بچہ کانفرنس منعقد ہو رہی ہے
جس میں ہندوستان بھر کے بچوں کے نمائندے شریک ہوں گے۔اس کانفرنس
میں بچوں کے لئے مندرجہ ذیل حقوق تسلیم کئے جائیں گے:۔

۱۔ ہر بچے کو آزادی سے رہنے کا حق ہے۔

۲۔ غریبی، امیری اور ذات پات کا کوئی فرق نہ ہونا چاہیئے۔

۳۔ بچے کو محبت اور احترام کی نگاہوں سے دیکھنا چاہیئے۔
۴۔ اپاہج بچوں کی تعلیم و تربیت کا انتظام ہونا چاہیئے۔
۵۔ بچوں کی ماؤں کے لئے دودھ کا مناسب انتظام کیا جائے۔

معلوم نہیں کہ یہ حقوق کس نے تجویز کئے ہیں۔ بچے ان کو پڑھیں گے تو سر پیٹ لیں گے۔ کیونکہ وہ اپنے جو حقوق منوانا چاہتے ہیں۔ وہ بالکل مختلف ہیں اگر کانفرنس کا ایجنڈا کوئی بیسویں صدی کا بچہ مرتب کرتا۔ تو کچھ اس قسم کا ہوتا:۔

۱۔ ہر بچے کو مادر پدر آزاد رہنے کا حق ہے۔
۲۔ لکھنے۔ پڑھنے۔ گولیاں کھیلنے اور پتنگ اڑانے میں کوئی فرق نہیں ہونا چاہیئے۔
۳۔ غریب بچوں کو سینما دکھانے کا خاص انتظام ہونا چاہیئے۔
۴۔ ماؤں اور باپوں کے لئے بچوں کو پیٹنا ناقابل ضمانت جرم قرار دیا جانا چاہیئے۔

بات دراصل یہ ہے۔ کہ جب بچہ کانفرنس کا ایجنڈا تیار ہوا۔ تو اس وقت وہاں کوئی بچہ موجود نہیں تھا۔ شاعر نے کہا ہے ؎

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا

بچے اپنی کانفرنس کا ایجنڈا پڑھ کر چلا اٹھیں گے۔ کہ ؎

پکڑے جاتے ہیں بزرگوں کے لکھے پر ناحق
بچہ کوئی بھی ہمارا دم تحریر نہ تھا

(۵)

میرٹھ کی خبر ہے۔ کہ میرٹھ ریلوے سٹیشن پر ایک انگریز نے اپنا کتا بک کرا دیا۔ کتا سٹیشن ہی پر مر گیا۔ انگریز کو فرنٹیر میل پر سوار ہونا تھا۔ اس نے ریلوے حکام سے کہا۔ کہ جب تک میرا کتا دفنایا نہ جائے۔ اس وقت تک گاڑی کو چلنے نہ دیا جائے۔ ریلوے افسروں نے کہا۔ کہ ایسا کرنا ناممکن ہے۔ مگر کافی تکرار کے بعد فیصلہ ہوا۔ کہ گاڑی کو روک لیا جائے۔ چنانچہ ٹرین آٹھ گھنٹے لیٹ ہو گئی۔ یہ واقعہ عبوری حکومت کے بعد کا ہے۔ جب ریلوے کا محکمہ ایک ہندوستانی ممبر مسٹر آصف علی کے ماتحت آچکا تھا۔ اگر نقل اختیارات کا یہی عالم ہے۔ تو ہندوستانیوں کی خود مختاری معلوم۔ بہر حال خدا کا شکر ہے۔ کہ صرف انگریز کا کتا ہی مرا۔ اگر انگریز خود مر جاتا۔ تو شاید گاڑی اس وقت تک روانہ نہ ہو سکتی۔ جب تک مرحوم صاحب بہادر کا چہلم نہ ہو جاتا۔

(۶)

پنڈت گووند بلبھ پنت وزیر اعظم یو پی اپنے بنگلے میں چائے پی رہے تھے۔ کہ آپ نے ایک خوش پوش آدمی کو باغ میں ادھر ادھر ٹہلتے دیکھا۔ آپ نے مہمان کو اندر بلا لیا۔ اور میز کے قریب بیٹھنے کے لئے کرسی پیش کی۔ پنڈت جی نے اس سے دریافت کیا۔ کہ کہئے میرے لائق کیا خدمت ہے۔ مہمان نے جواب دیا۔ کہ غیر ملکی بنکوں میں میرا کافی روپیہ جمع تھا۔ جو ضبط کر لیا گیا ہے۔ پنڈت جی نے اسے ایک درخواست لکھنے کو کہا۔ اور یقین دلایا کہ میں حتی الوسع امداد کرونگا۔ اس طرح گفتگو کا ایک دور ختم ہوا۔ پھر پنڈت جی نے مہمان سے دریافت کیا۔ کہ جس وقت آپ کا روپیہ ضبط ہوا تھا۔ اُس وقت آپ کیا کام کرتے تھے؟ مہمان نے فوراً جواب دیا۔ کہ میں اُس وقت ہندوستان کا وائسرائے تھا۔ وزیر اعظم نے ایک دم گفتگو بند کر دی اور اپنے سکرٹری کو بلا کر کہا۔ کہ ان کو باہر جانے کا راستہ دکھائیے۔ پنڈت جی نے بھی کمال کر دیا۔ انہیں چاہیئے تھا۔ کہ مہمان کو باہر جانے کا راستہ دکھانے کی بجائے اسے پاگل خانے بھجوا دیتے۔ جہاں ایسے کئی "وائسرائے" موجود ہیں۔ ایک موقعہ انگلستان کا وزیر اعظم پیدل سیر کر رہا تھا۔ کہ دفعتاً بارش شروع ہو گئی۔ آپ کے پاس نہ چھتری تھی نہ برساتی۔ سامنے پاگل خانے کی عمارت تھی جس کے پھاٹک پر سنتری بندوق تھامے پہرہ دے رہا تھا۔ وزیر اعظم نے کہا۔ کہ دروازہ کھول کر مجھے بارش سے پناہ دو۔ میں انگلستان کا وزیر اعظم ہوں۔ سنتری نے جواب دیا۔ کہ "بھاگو یہاں سے! اس عمارت کے اندر کئی وزیر اعظم پہلے ہی موجود ہیں"۔

(۷)

سنت نگر لاہور کی ایک عمارت میں کئی کرایہ دار بستے ہیں۔ اس عمارت کے مالک کے خلاف پرانی انارکلی پولیس میں رپورٹ درج کرائی گئی ہے۔ کہ وہ کرایہ داروں کو مکان اور دکانیں خالی کر لینے کے لئے کہتا رہا۔ لیکن کرایہ داروں نے نکلنے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ تلاش بسیار کے باوجود انہیں مکان نہ ملتا تھا۔ اس پر مالک مکان نے کرایہ داروں کو تنگ کرنے کیلئے ایک نیا ڈھنگ نکالا اس نے تین ماہ تک بجلی کا بل ادا نہ کیا۔ جس پر بجلی کمپنی والوں نے بجلی بند

کردی اور میٹر اُتار کر لے گئے۔ اس پر ساری عمارت میں مکمل "بلیک آؤٹ" ہو گیا۔ کرایہ دار دل نے غلطی کی۔ کہ رپٹ درج کرادی۔ انہیں چاہئے تھا۔ کہ "بلیک آؤٹ" کا جواب "بلیک مارکیٹ" سے دیتے۔ "بلیک مارکیٹ" میں عمارتیں بھی بک سکتی ہیں۔

(۸)

آجکل مکانوں کی قلت کا یہ عالم ہے۔ کہ مکان بالکل نایاب ہیں۔ پہلے تو جا بجا "کرایہ کیلئے خالی ہے"۔ یا "TOLET" کے بورڈ مکانوں اور دکانوں پر لگے ہوتے تھے۔ اور ان بورڈوں کی اتنی ضرورت پڑتی تھی۔ کہ بعض کتب فروشوں نے یہ بورڈ کاغذوں پر چھپواکر برائے فروخت رکھ چھوڑے تھے۔ لیکن آجکل "TOLET" صاحب شاید ولایت چلے گئے ہیں کہ ان کے نام کا بورڈ کہیں نظر نہیں آتا۔ حالانکہ ان بورڈوں کی وجہ سے یہ معلوم ہوتا تھا۔ کہ آدھا شہر ٹولٹ صاحب کی ملکیت ہے۔ بہرحال مکانوں کی قلت کے متعلق ایک دلچسپ لطیفہ سنئے۔ ایک شخص دریائے راوی میں ہاتھ پاؤں مارتا ڈوبتا جارہا تھا۔ کہ کنارے پر سے ایک شخص نے کہا: "ارے بھائی ڈوبنے والے! اپنا نام اور اپنے مکان کا پتہ تو دیتے جاؤ"۔ اس نے نام پتہ بتادیا۔ یہ شخص بھاگا بھاگا اس مکان کے مالک کے پاس پہنچا اور کہنے لگا۔ کہ آپ کا کرایہ دار دریا میں ڈوب کر مر گیا ہے۔ اس لئے مکان جس میں وہ رہتا تھا۔ مجھے کرائے پر دیدیجئے اور تین مہینے کا کرایہ پیشگی لے لیجئے۔ مالک مکان نے ایک قہقہہ لگایا۔ اور کہا۔ ارے بھولے آدمی! جس شخص نے اسے دریا میں دھکا دیا ہے اس نے ایک سال کا کرایہ مجھے پیشگی دے رکھا ہے۔

(۹)

نیویارک سے اطلاع آئی ہے۔ کہ وہاں ایک ۳۵ سالہ نوجوان نے ایک ۷۰ سالہ بوڑھی بیوہ سے شادی کر لی ہے۔ عورت کے سر کے بال برف کی طرح سفید ہو چکے ہیں۔ اور اس کے چار لڑکے اور بارہ پوتے موجود ہیں۔ اس شخص نے اخباری نمائندے کو بیان دیتے ہوئے کہا۔ کہ اگرچہ میری بیوی کی عمر قدرے زیادہ ہے۔ لیکن مجھے یہ اطمینان ہے۔ کہ کوئی نوجوان اسے ورغلا کر مجھ سے جدا نہ کر سکے گا۔ اس نوجوان کی احتیاط قابل تعریف ہے۔ اور ممکن ہے کہ کوئی نوجوان اس بڑھیا کو اغوا کرنے کی کوشش نہ کرے۔ لیکن اگر اس عورت نے جو ۷۰ سال کی عمر میں بھی شادی کی ہوس رکھتی ہے۔ کسی نوجوان کو اغوا کر لیا۔ تو پھر کیا ہوگا؟